

# عدل کا اسلامی تصور



پروفیسر رفیع اللہ شہاب



21633

DATA ENTERED

# عہدہ کا اسلامی تصور

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

مقبول ایڈیٹری  
یسرکلرز روڈ چوک اردو بازار لاہور

۲۹۷۶۳۲

ش ۱۸۱ ع

۱۱۷۷۶۱

۱/۱

© جملہ حقوق محفوظ

ملک مقبول احمد	اہتمام
مقبول اکیڈمی	ناشر
انیس یعقوب	سرورق
خورشید مقبول پریس	مطبع
500 روپے	قیمت

اسلام کے عدالتی نظام کا امتیاز

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان

(سورت النحل - آیت - ۹۰)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ (انسانوں) کو عدل کرنے اور خوبصورت

طرز عمل اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔



# فہرست مضمومات

## تعارف۔

### پہلا حصہ

#### عدل اور اسلامی عدالتی نظام

- 15 1 عدل اور عدالتی نظام کا اسلامی تصور۔
- 22 2 عدل و احسان کا اسلامی مفہوم۔
- 26 3 اسلامی عدالتی نظام کا طریق کار۔
- 32 4 اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کی ایک کوشش۔
- 36 5 اسلام کا عدالتی نظام بازیچہ اطفال نہ بتایا جائے۔
- 42 6 اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کی خواہش۔
- 51 7 انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یا نائب نہیں ہے۔
- 64 8 عدالتی مقدمات کی تعداد کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے۔
- 69 9 اجتماد اور عدلیہ کی ذمہ داری۔
- 76 10 علامہ اقبال اور اسلامی قانون کی تشکیل جدید۔
- 81 11 مختلف اسلامی ادوار میں اسلامی عدالتی نظام کا طریق کار۔
- 89 12 اسلامی عدالتی نظام کی بنیاد۔ قرآن حکیم۔
- 94 13 رسول اللہ صلعم اور مساوات محمدی۔
- 100 14 رسول اللہ صلعم دنیا کے عظیم قانون دان۔
- 104 15 اسلامی مساوات اور کراچی کے مسائل کا اسلامی حل
- 109 16 اسلامی عدالتی نظام کے لئے اسلامی معاشرے کی تشکیل
- 114 17 اسلام کے عدالتی نظام کی روح۔

## دو سہ احصہ

### اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد

- 121 1 اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ میں روکاؤ ہیں۔
- 125 2 اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے واضح طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت
- 130 3 اسلامی نظام کے نام پر جمہوریت کے خاتمے کی جدوجہد۔
- 135 4 اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے جدوجہد۔
- 140 5 عدالتوں کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کی ضرورت۔
- 144 6 شرعی عدالت کا دائرہ کار۔
- 148 7 عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی۔
- 153 8 آئین میں آٹھویں ترمیم کی اسلامی دفعات کا جائزہ
- 158 9 شریعت اسلامی اور عوام کو درپیش معاشی مسائل۔
- 163 10 قرآن و سنت کا قانون یا حنفی فقہ۔
- 167 11 اسلامی معاشرہ سے فرقہ پرستی ختم کرنے کی کوشش۔
- 171 12 شریعت اسلامی میں تفرقہ بازی کی ممانعت۔

## تیسرا حصہ

### اسلامی طریقہ تفتیش

- 179 1 اسلامی طریقہ تفتیش سے مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح ہوتی ہے۔
- 184 2 جرائم کی تفتیش کا اسلامی طریقہ۔
- 188 3 تصویر یا فوٹو جرائم کی تفتیش کا اہم ذریعہ ہیں۔
- 190 4 قرآن مجید میں تصاویر کا ذکر۔
- 202 5 احادیث اور حرمت تصاویر کے بارے میں فقہاء کا مسلک۔



- 213 6 خفیہ تفتیشی اداروں کی اصلاح کی ضرورت۔
- 217 7 نفاذ اسلام۔ مالی فوائد اور پولیس۔
- 221 8 انسانی معاشرے میں امن قائم کرنے کے اسلامی اصول۔

## چوتھا حصہ

- 227 1 شرعی حدود کا فقہی تصور
- 239 2 اسلامی قانون میں کوڑوں کی سزا کا تصور۔
- 243 3 بدکاری کی تہمت از خود سنگین جرم ہے۔
- 248 4 مسئلہ ارتداد کے بارے میں شرعی حکم کی غلط تعبیر۔
- 253 5 چوری کی شرعی حد۔
- 260 6 چوری کی شرعی حد کے بارے میں غلط فہمی۔
- 266 7 دور رسالت اور خلافت راشدہ میں کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا۔
- 270 8 شریعت اسلامی میں عورت کی دیت کا مسئلہ۔
- 274 9 اسلامی شریعت اور انسانی اعضاء کی پیوند کاری۔
- 279 10 ہیروئن کی آمدنی سے یورپ میں تبلیغ دین۔
- 283 11 کیا اسلامی مملکت کے حکمران شرعی حدود سے بالا ہیں۔
- 287 12 عورت حکمران بھی بن سکتی ہے اور قاضی اور کمانڈر انچیف بھی۔
- 292 13 حضرت عائشہؓ کی جانب سے مسلمان حکمرانوں کا احتساب۔
- 297 14 مطلقہ عورت کے اسلامی حقوق۔
- 303 15 اسلامی عدالتی نظام کے ذریعے عورتوں سے ناانصافیاں ختم کرنی ہوں گی۔

## ضمیمہ

اسلامی ریاست کے عدالتی نظام پر ایک کتاب کا تعارف



## تعارف

قیام پاکستان کے بعد ہی سے ملک عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود اس بارے میں ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ ہاں کچھ عرصہ پہلے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق صاحب نے اسلام کے عدالتی نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ انہوں نے اسلامی عدل کے اصولوں کو اپنائے بغیر ایسا کیا تھا اس لئے اس کے مطالبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ موجودہ حکومت نے ایک دفعہ پھر اسلام کے عدالتی نظام کو نافذ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے قومی اسمبلی سے شریعت بل بھی پاس کر دیا جا چکا ہے کیبنٹ سے اس کی توثیق کے بعد اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

جنرل صاحب نے جب اسلامی عدل کے بغیر اسلام کے عدالتی نظام کو نافذ کیا تو راقم نے ان کی توجہ اس طرف دلائی کہ اگر وہ اس نظام سے مثبت نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر موجودہ معاشرے کو اسلامی عدل کے اصولوں کے مطابق استوار کرنا ہوگا اور اس نظام کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے اسلامی قانون کے ماہروں کی ایک جماعت تیار کرنی ہوگی۔ جنرل صاحب نے اس بارے میں میری مختلف تحریروں کا

نوٹس لیا اور بات چیت کی دعوت دی لیکن انہوں نے اسلامی عدل پر گفتگو کی بجائے صرف زکوہ اور عشر آرڈیننس تک بات کو محدود رکھا۔ اس آرڈیننس کے بارے میں راقم نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور اسلامی عدالتی نظام کے کامیابی میں روکاٹ ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اس آرڈیننس کے عشر والے حصے کو فوری طور پر معطل کر دیا تھا۔ لیکن پھر چار سال بعد معطلی کا یہ حکم واپس لے لیا تھا۔

اب جب کہ موجودہ حکومت، اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کے بارے میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہے تو راقم نے مناسب سمجھا کہ اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے راقم نے جو تجاویز جنرل صاحب کے سامنے پیش کی تھیں انہیں کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے تاکہ اس نظام کی خواہش کرنے والے حضرات اور اس سے دلچسپی رکھنے والے حکمران، اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس دوران بعض علماء نے اسلامی عدالتی نظام سے متعلق کچھ مسائل کے بارے میں اختلاف کا اظہار کیا تھا مثلاً یہ کہ تصاویر اور فوٹو شریعت اسلامی میں حرام ہیں جبکہ آج کل جرائم کی تفتیش میں ان کو اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام مسائل کے بارے میں، اس کتاب میں صحیح اسلامی نقطہ نظر پیش کر دیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس بندہ ناچیز کی یہ ناتمام سی کوشش، ملک عزیز میں اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں مدد و معاون ثابت ہوگی اس نظام کے ذریعے یقیناً متاثرہ لوگوں کو سستا اور فوری انصاف مل سکے گا۔ جس سے ہمارے معاشرے میں نہ صرف یہ کہ جرائم کی تعداد کم ہو جائے گی بلکہ بہت سی برائیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور مصیبت زدہ لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ اسلامی نظام واقعی ان کے لئے باعث رحمت ہے۔

رفیع اللہ شہاب

لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۹۹

پہلا حصہ

عدل اور اسلامی عدالتی نظام



## عدل اور عدالتی نظام کا اسلامی تصور

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس خطہ زمین میں مسلمان اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق گزار سکیں۔ لیکن ملک عزیز کے قیام پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور ابھی تک اس بارے میں کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بعض حکمرانوں نے اسلام کے عدالتی نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس بارے میں انہیں صحیح اسلامی تعلیمات کا علم نہیں تھا اس لئے ان کی کوششیں کوئی مثبت نتائج پیدا نہ کر سکیں۔

ہمارے ہاں انگریزوں کا عطا کردہ عدالتی نظام مروج ہے ہمارے قانون دان بھی اسی نظام کے ماہر ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی ایک دو فرد ایسے ہوں کہ جنہیں اسلامی قانون پر مناسب دسترس حاصل ہو اس لئے جب تک ملک میں اسلامی قانون کے ماہرین کی ایک جماعت پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن بد قسمتی سے اس بارے میں ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ہمارے قانون کی تعلیم دینے والے کالجوں میں ابھی تک انگریزی قانون کی ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسلامی قانون میں مہارت حاصل کرنے کیلئے تو ضروری ہے کہ قانون کے نصاب میں اسلامی قانون کی مستند کتابیں شامل کی جائیں۔ جنہیں ان کی اصل زبان عربی میں پڑھایا جائے۔ حیرت کی بات ہے کہ یورپ

کے تمام ممالک میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملکی زبان کے علاوہ لاطینی زبان کا علم بھی ضروری ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک عربی زبان کو یہ اہمیت نہیں دی گئی۔ انگریز کے مروجہ عدالتی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک تو یہ بہت مہنگا ہے دوسرے مقدمات کے فیصلوں میں مہینوں بلکہ بعض اوقات کئی سال لگ جاتے ہیں۔ جبکہ اسلامی عدالتی نظام کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے مقدمات کے فیصلے دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں ہو جاتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اسلام کے عدالتی نظام کے ذریعے متاثرہ لوگوں کو فوری انصاف مہیا کیا جاسکتا ہے لیکن اس نظام کے نفاذ سے پہلے معاشرے کی تشکیل اسلامی عدالت کے اصولوں پر ضروری ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر اسلامی عدل اور اسلامی عدالتی نظام کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں مختلف ہیں اور اسلامی عدالتی نظام کو کامیابی کے لئے، معاشرے کو اسلامی عدل کے مطابق استوار کرنا ضروری ہے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اسلامی عدل کو سوشل جسٹس یا سماجی انصاف کیا جاتا ہے، اس کے ذریعے معاشرے سے معاشی ناہمواری دور کر کے، ہر فرد معاشرہ کی بنیادی ضروریات کو ضمانت دی جاتی ہے۔ ایسے معاشرے میں سرمایہ داروں کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ غریب مختلف کشتوں کی محنت کا استحصال کر سکیں۔ اسی مقصد کے لئے ربو جس کا ترجمہ سود کیا جاتا ہے شریعت اسلامی میں بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ قرآن مجید میں اسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلعم یعنی اسلامی ریاست سے بغاوت قرار دیا گیا ہے۔

دور رسالت اور خلافت راشدہ کے دوران جب اسلام کے عدل اجتماعی کا پورا پورا خیال کیا گیا تو اس دور میں امیر اور غریب کے درمیان بہت کم فرق رہ گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے خود رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین نے عملی نمونے پیش کئے۔ رسول اللہ صلعم اسلامی ریاست کے سربراہ تھے اگر آپ چاہتے تو اپنے وقت



کے حکمرانوں کی طرح اپنے لئے شاندار محل بنا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے کی بجائے ایک ایسا سادہ مکان میں رہنا پسند کیا کہ جو معاشرے کا غریب آدمی بھی اپنے لئے بنا سکتا تھا۔ اس زمانے میں گھوڑا، امیر لوگوں کی سواری، تھا اور متوسط طبقے کے لوگ اونٹ اپنی سواری کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جبکہ غریب لوگوں کو مشکل سے گدھے کی سواری میسر تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے غریبوں کا خیال کرتے ہوئے گھوڑے کی بجائے، اونٹ اور گدھے کو اپنی سواری کے لئے منتخب فرمایا۔

صحابہ کرام نے بھی آپ کی تقلید کی۔ خلفائے راشدین کی زندگیاں بھی آپ کی طرح سادہ تھیں۔ خلیفہ ثالث، عرب کے امیر ترین شخص تھے کہا جاتا ہے کہ تجارتی قافلوں میں ہزاروں اونٹوں پر ان کا سامان تجارت ہوتا تھا۔ لیکن اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنا تمام مال، مسلمانوں کی بہبودی پر خرچ کر دیا ہے۔ یہاں تک کے وفات کے وقت آپ کے گھر میں صرف دو اونٹ رہ گئے تھے۔

اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں چند فیصدی لوگ، ملک کی کثیر آبادی کا استحصال کر رہے ہیں۔ وہ تو عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں جبکہ غریب لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو کہ اخبارات میں ملک کے کسی نہ کسی حصے سے ان غریب لوگوں کی خود کشی کی خبریں شائع نہ ہوتی ہوں۔ ایسے معاشرے میں اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ سے مثبت نتائج کیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں؟

چوری ایک ایسا سنگین جرم ہے عام طور پر اس کا ارتکاب ایسے لوگ کرتے ہیں جو فاقہ کشی کی وجہ سے موت کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ شریعت اسلامی نے معاشرے سے اس جرم کے خاتمے کے لئے نہایت ہی سخت سزا مقرر کی ہے۔ وہ سزا چور کا ہاتھ کاٹنا ہے۔ لیکن اس شرعی حد کے نفاذ سے پہلے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اسلام کے عدل اجتماعی کے ذریعے معاشرے کے تمام افراد کی بنیادی ضروریات کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور حکومت میں جب مدینہ منورہ میں قحط پڑ گیا تو انہوں نے چوری کی شرعی حد کا نفاذ

مطل کر آیا۔ اور فرمایا کہ جب حکومت اس حالت میں نہیں کہ وہ معاشرے کے تمام افراد کی ضروریات کا مناسب بندوبست کر سکے تو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ چوروں کے ہاتھ کاٹی پھرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصے کے دوران ایک مالک نے آپ کے پاس شکایت کی کہ اس کے غلاموں نے اس کا ایک اونٹ چرا کہ ذبح کر کے کھالیا ہے۔ غلاموں نے اپنے جرم کا اقبال کیا لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ ان کا آقا نہیں پوری خوراک نہیں دیتا تھا اور انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر ایسا کیا تھا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے۔ ان کے مالک کو سرزنش کی کہ وہ انہیں مناسب خوراک مہیا کیا کرے۔

مستند روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو دور رسالت میں اور نہ ہی خلافت راشدہ کے دوران کسی چور کا ہاتھ کاٹا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے عدل اجتماعی کے ذریعے سے معاشرے کی تشکیل اس طرح کر دی گئی تھیں کہ اس جرم کے ارتکاب کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ اس کو مزید تفصیلات کتاب کے آئندہ صفحات میں قارئین کے سامنے آئے گی۔

لیکن بعد میں جب اسلامی حکومت، ملوکیت میں بدل گئی، اور حکمرانوں نے اپنی عیش پرستی کے لئے غریبوں کا استحصال کرنا شروع کیا۔ تو معاشرے میں جرائم میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ حکمرانوں کے اس طرز عمل کی وجہ سے ان کے کئی مخالف بھی پیدا ہو گئے۔ ان ظالموں نے معاشرے سے جرائم کے خاتمے کی بجائے اپنے مخالفوں کو ختم کرنے کے لئے ان پر شرعی حدود کا نفاذ شروع کر دیا۔ اس صورت حالات نے عظیم فقہاء کو بڑا پریشان کیا چنانچہ انہوں نے چوری کی شرعی حد کو اس طرح تشریح کی کہ حکمرانوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اسے اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں اس بارے میں امام شافعی نے یہ فتویٰ دیا کہ معاشرہ چونکہ اسلام کے عدل اجتماعی کی برکتوں سے محروم ہے اس لئے کسی چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے ہاں اسے اس جرم سے باز رکھنے کیلئے قید میں ڈالا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس جرم

سے توبہ کر لے بعد کے مسلمان حکمرانوں نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے، امام شافعی کے اس فتویٰ کو اختیار کر لیا۔ اس کی مزید تفصیلات کتاب میں ملیں گی۔

شریعت اسلامی میں دو طرح کے حقوق ہیں ایک حقوق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق جیسے عبادات وغیرہ اور دوسرے حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ حقوق اللہ کی کوتاہی کو تو معاف کر دے گا لیکن جن لوگوں نے اپنے بھائی بندوں کے حقوق غصب کئے ہونگے۔ وہ جب تک متعلقہ لوگ معاف نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ جب مسلمانوں میں ان حقوق کا احساس ہو جائے تو پھر جرائم کا ارتکاب خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں انسانوں کے حقوق کی حفاظت تو کجا جانوروں کے حقوق کی تلفی کی بھی اجازت نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو انسانوں کی خوراک اور دوسری سہولتوں کے لئے پیدا کیا لیکن اس امر کی اجازت نہیں دی کہ ان پر کسی بھی صورت میں ظلم کیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں ذبح کیا جائے تو ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ انہیں کم سے کم تکلیف ہو۔ اسی مقصد کے لئے جانوروں کی شکار کرنے کی اجازت دی گئی۔ ان کا شکار کھیلنے سے منع کر دیا گیا۔ جب کہ آج کل ان جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے جو حرام ہے۔

ملک عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ تو قیام پاکستان کے بعد ہی کیا جانے لگا ہے۔ لیکن اس بارے میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی۔ بلاشبہ بعض حکمرانوں نے اسلام کے عدالتی نظام کا موجودہ انگریز کا عدالتی نظام میں پیوند لگانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے مثبت نتائج نہ نکل سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے عدالتی نظام کو کامیابی کے لئے معاشرے کو اسلام کے عدل اجتماعی کے اصولوں پر ڈھالنا، بنیادی شرط تھی۔ ایسا کرنے کی بجائے، الٹا سرمایہ داری نظام اور فیو ڈلزم کا جزیں مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی۔ خیال رہے کہ اسلام کے عدل اجتماعی کی روشی میں اسلامی معاشرے میں زمین کی خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہر

ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے دوسرے الفاظ میں ایسے اسلامی معاشرے میں فیوڈلز کو سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جبکہ ہمارے بعض جید علماء نے فیوڈلز کو اسلامی ادارہ ثابت کرنے کیلئے مستقل کتابیں لکھیں۔ ایسے معاشرے میں اسلام کا عدالتی نظام کیسے مثبت نتائج دے سکتا ہے؟

آج ساری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جب تک معاشرہ کو عدل اجتماعی کے اصولوں پر ڈھال کر، رفاہی مملکت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا اس وقت سے معاشرے سے جرائم کا خاتمہ ممکن نہیں۔ چنانچہ موجودہ دور میں یورپ کے بہت سے ممالک نے اپنے اپنے ممالک کو فلاحی ریاستوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ برطانیہ جو یورپ کا امیر ترین ملک ہے اس کا وزیرِ عظم اپنے دفتر کے اوپر ایک ایسے مکان میں رہتا ہے کہ جس میں تین یا چار سونے کے کمرے ہیں۔ امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں ہمارے غریب ملک کے وزیرِ اعظم کی رہائش اخباری اطلاعات کے مطابق امریکی صدر کی رہائش گاہ سے دس گنا بڑی ہے۔ اس سے دوسری سہولتوں کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ہمارے حکمران، ملک عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں مخلص ہیں تو انہیں معاشرے کو اسلام کے عدل اجتماعی کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ خود سادہ طرز زندگی اختیار کرنا ہوگا۔ اور یہ کوشش کرنی ہوگی کہ ملک میں امیر اور غریب میں معاشی تفاوت کم ہو۔ اور معاشرے میں کوئی فرد بھوکا نہ رہ جائے۔ اس صورت میں، اسلام کا اجتماعی نظام اپنے ضرور مثبت نتائج دے گا۔ معاشرے سے نہ صرف یہ کہ جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ دوسری بہت سی خرابیوں کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔

اس بارے میں ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ کہ مقدمات کی کارروائی غیر ملکی زبان کی بجائے مقامی زبان میں ہوگی۔ مختلف اسلامی اداروں میں مقدمات کے

لئے وکلاء حضرات کی خدمات حاصل نہیں کی جاتی تھیں۔ قاضی ہی فریقین کی باتیں سن کر ان کے درمیان فیصلہ کرتا تھا۔ جب کہ آج کل وکلاء کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں بھی غریب لوگوں کو سہولتیں مہیا کرنا ہوگی تاکہ وہ اسلام کے سستے اور فوری انصاف کو برکات سے فیض یاب ہو سکیں۔



## عدل و احسان کا اسلامی مفہوم

۱۳ اگست ۱۹۸۸ء کو یوم آزادی کے موقع پر قومی پرچم لہرانے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر محمد ضیاء الحق مرحوم نے اعلان کیا کہ ملک عزیز میں ۱۶ نومبر سے پہلے پہلے عدل و احسان کا نظام قائم کر دیا جائے گا۔ عدل اور احسان اسلامی نظام کی اہم اصطلاحات ہیں۔ اس لیے ان پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

عربی زبان میں عدل کے لفظی معنی برابری کے ہیں۔ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ باندھا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک کو عدل کہتے ہیں اگر دونوں کے وزن میں کمی بیشی ہوگی تو انہیں عدل نہیں کہا جائے گا اور اس صورت میں اونٹ کے لیے ایسا وزن اٹھانا باعث تکلیف ہوتا ہے۔ اونٹوں کے مالکوں کو اس کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ان اونٹوں کا بوجھ کم کرنے کی بجائے انہیں برابر کرنے کی بہت کوشش کرتے ہیں اور جس طرف بوجھ کم ہو، اس طرف پتھر باندھ دیتے ہیں۔ پتھر باندھ دینے سے بظاہر اونٹ کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ دونوں طرف کا بوجھ برابر ہو کر عدل بن جاتے ہیں، اس لیے اونٹ کو یہ زیادہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ عربی لفظ عدل کے اردو ترجمے انصاف کا بھی یہی مفہوم ہے

۱۱۷۷

یعنی دوسرا نصف حصہ۔

احسان کا مادہ حسن ہے جس کے معنی ہم خوبصورتی کرتے ہیں لیکن عربی زبان میں کسی بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کرنے کو احسان کہتے ہیں۔ اوپر والی مثال میں اونٹ کے دونوں طرف کے بوجھ کو برابر کرنے کیلئے اس کے ایک طرف کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے لیے جو پتھر باندھا گیا ہے وہ اصل میں اس اونٹ سے احسان کیا گیا ہے کیونکہ اس طریقے سے اس کے بوجھ کا توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور لغت مفردات القرآن میں احسان کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احسان دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا، یعنی اس کی کمی پورا کر کے، اس کا توازن درست کر دینا۔ دوسرے خود اپنی سیرت و کردار میں توازن پیدا کرنا۔

اسلامی معاشرے کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ہوتی ہیں۔ اس معاشرے میں کسی فرد سے نا انصافی نہیں ہوتی یعنی ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے، کوئی دوسرا اس کی محنت کا پھل ناجائز طریقے سے حاصل نہیں کر سکتا۔ پرانے زمانے میں اور آج کے دور میں بھی سودی نظام ایک ایسا طریقہ تھا اور ہے جس کی مدد سے سرمایہ دار غریب محنت کشوں کی محنت کا پھل ناجائز طریقے سے حاصل کر لیتے تھے اور کر لیتے ہیں اس لیے اسلام نے اسے انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم قرار دیا۔ اسلام میں اس سے زیادہ سنگین جرم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ قرآن مجید نے اسے اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔

اس اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے قرآن مجید میں یہ ہدایات نازل ہوئیں۔

ترجمہ: اے لوگوں! جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے

کہ تم انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

(سورہ المائدہ: ۸)

ان ارشادات ربانی کی روشنی میں علمائے اسلام نے اسلامی حکومت کے جو فرائض قرار دیے ہیں، انہیں علامہ ابن رشد قرطبی نے ان الفاظ میں یہ بیان کیا ہے۔

ترجمہ: اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ کو اس کی محنت کا پورا پورا پھل دلوائے کوئی اس کی محنت کا استحصال نہ کر سکے یہ تو ہوا مالی معاملات میں عدل اور انسانی جانوں کے معاملوں میں بھی عدل قائم کیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی پر ظلم کیا جائے تو مظلوم کو اس کا بدلہ دلوایا جائے۔ ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا دی جائے یہ سب عدل کے تقاضے ہیں۔

(بدایۃ المجتہد جلد دوم نمبر ۴۳)

قریش مکہ کو اسلام کی دعوت پر غصہ ہی اس وجہ سے تھا کہ اس کی بنیاد عدل و احسان پر تھی۔ جس کے مطابق حاکم و محکوم، آزاد اور غلام طاقتور اور کمزور بہادر امیر و غریب کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا۔ سب کنگھی کے دانوں کی طرح برابر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ آپس میں اونچ نیچ کا برتاؤ نہ کریں۔ اور اس کی عملی پیش کرنے کے لیے آپ نے عملاً اس طرح زندگی گزاری جس طرح کہ اسلامی معاشرے کا ایک عام فرو گزار سکتا تھا۔

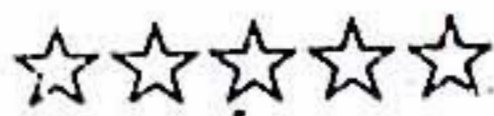
شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام نے غلامی کو ختم نہیں کیا تو یہ دراصل اس تدریجی طریقے کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے عرب معاشرہ غلام اور آقا کے دو طبقات تھے۔ اسلام نے دونوں کا درجہ برابر کر دیا معاشرے میں جو غلام پہلے سے موجود تھے انہیں اسلامی معاشرے کے برابر کے شہری بنانے کے لیے مختلف



اقدامات کئے گئے اور آئندہ کے لیے قرآن مجید کی سورہ محمد کی آیت نمبر ۴ نازل ہوئی جس میں غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ لیکن بعد میں ملوکیت نے اپنے مفادات کے لیے غلامی کے ادارے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

اسلام کی رسی عدل و احسان کی تعلیمات تھیں جن کی وجہ سے قریش مکہ جو صدیوں سے اہل عرب کی سرداری کرتے چلے آ رہے تھے۔ آگ بگولا ہو گئے تھے۔ قریش مکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے منکر نہیں تھے۔ لیکن ان کے ذہنوں میں توحید کا محدود تصور تھا۔ جس کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر قریش کو توحید الہی کے اس محدود و تصور کو دعوت دی جاتی اور ان کے سماجی اور اقتصادی نظام میں جو اونچ نیچ تھی، اسے نہ چھیڑا جاتا تو ان کی بڑی اکثریت آسانی سے ایمان لے آتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قریش کے لوگ اپنے بتوں سے مخلصانہ عقیدت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں ان کی کیفیت، تذبذب کی سی تھی۔ یہ سارے بت ان کی نگاہ میں اصل مقصود نہیں تھے۔ بلکہ عام عربوں کو قابو رکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کا غیظ و غضب جس قدر بتوں کی مذمت کی وجہ سے تھا اس سے کہیں زیادہ اس بات پر تھا کہ اسلام کی عدل و احسان کی تعلیمات سے ان کا سماجی نظام ہلنے لگا تھا اور آپ ایک ایسے عدل پر مبنی معاشرے کی دعوت دیئے تھے جو ان کی سیادت و قیادت کے مفادات کے خلاف تھا۔ عدل و احسان کے نظام کے قیام سے ہمارے معاشرے سے ناہمواریاں ختم ہونی شروع ہو جائیں گی۔ ہر فرد معاشرہ کے ساتھ انصاف ہوگا۔ کوئی کسی کا حق نہیں چھینے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو حکومت اسے کرنے سے روک کر عدل و مساوات قائم کرے گی۔ اس طرح ایک صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی طرف یہ ایک بہت ہی اہم پیش رفت ہوگی۔ (اگست ۱۹۸۸)



## اسلامی عدالتی نظام کا طریق کار

اسلامی عدالتی نظام کا طریق کار، انسانی معاشرے کیلئے اتنا زیادہ مفید ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں، اسے اختیار کر رہی ہیں۔ اس طریق کار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ عدالتوں سے باہر افہام و تفہیم کے ذریعے ہو جائے۔ اس سے ایک تو عدالتوں پر مقدمات کا بوجھ کم ہو جاتا تھا اور دوسرے لوگوں کو فوری اور سستا انصاف مل جاتا تھا۔ اس نظام عدل میں جہاں عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے کرنے کیلئے حکومت کی جانب سے قاضی مقرر کئے جاتے تھے وہاں عدالتوں سے باہر مفتی حضرات موجود ہوتے تھے۔ جو لوگ عدالتوں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے وہ ان مفتی حضرات سے متعلقہ مقدمے کے بارے میں شریعت اسلامی کا فیصلہ پوچھ لیتے اور پھر باہمی افہام و تفہیم سے اس پر عمل کرتے۔ آج امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس طریق کار کو اختیار کیا جا چکا ہے اور وہاں بھی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ عدالتوں سے باہر ہی ہو جائے۔ عام لوگوں کو تو جانے دیجئے حال میں خود امریکہ کے صدر نے اپنے ایک مقدمے کا فیصلہ عدالت سے باہر افہام و تفہیم کے ذریعے کیا ہے۔

ابتداء میں تو حکومت کی طرف سے صرف قاضی مقرر کئے جاتے تھے، مفتی

حضرات کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ انہیں اسلامی علوم پر کانی دسترس ہوتی تھی اس لئے معاشرے میں ان کا ایک مقام ہوتا تھا۔ بلکہ قاضی حضرات سے بھی زیادہ عزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ اسلامی نظام عدل کا یہ طریق کار بہت ہی موثر تھا اس لئے بعد میں حکومتوں نے سرکاری طور پر بھی مفتی مقرر کرنے شروع کئے لیکن عوام کو جو اعتماد غیر سرکاری مفتیوں پر تھا۔ یہ سرکاری مفتی وہ اعتماد حاصل نہ کر سکے۔ وجہ یہ تھی کہ بعض اوقات غیر عالم لوگوں کو مفتی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ جو اسلام کے مفید عدالتی نظام کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ عوام صرف ان مفتی حضرات کے پاس جاتے تھے کہ جن پر انہیں اعتماد ہوتا تھا۔ آج ہمارے ملک میں اس نظام کو سرکاری طور پر تو نہیں اپنایا گیا لیکن ابھی تک اس کے کچھ آثار باقی ہیں اور اکثر نیک لوگ اپنے مقدمات، عدالتوں میں لے جانے کی بجائے، ان مفتی حضرات سے معاملے کی شرعی حقیقت معلوم کر کے اس پر عمل کرتے ہیں۔

اس نظام کی بنیاد رسول اللہ صلعم کے ایک مشہور عدالتی فیصلے پر رکھی گئی تھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ دو فریق اپنا مقدمہ لیکر دربار رسالت میں پیش ہوئے۔ یہ مقدمہ جائیداد کی تقسیم کے بارے میں تھا۔ رسول اللہ صلعم نے مقدمے کے فیصلے سے پہلے فریقین پر یہ واضح کر دیا کہ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک فریق، زبان کا تیز و طرار ہو اور اسے زیادہ باتیں بنانی آتی ہوں اور اپنے حق میں موثر دلائل دے سکتا ہو۔ جبہ دوسرا فریق ایسا نہ لے سکتا ہو اور میں چونکہ ایک انسان ہوں۔ اس کے دلائل کی بنیاد پر اس کے حق میں فیصلہ دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر ایسے فریق نے میرے فیصلے کے ذریعے اپنے فریق مخالف کی حق تلفی کی تو قیامت کے دن اسے دوگنا عذاب دیا جائے گا۔ رسول اللہ صلعم نے یہ بات کچھ ایسے موثر پیرائے میں کہی کہ مقدمے کا جو فریق دوسرے فریق کی حق تلفی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سخت شرمندہ ہوا اور رسول اللہ صلعم سے اپنے قصور کی معافی چاہی اور اعلان کیا کہ

وہ کسی بھی صورت میں دوسرے فریق کی حق تلفی نہیں کرے گا بلکہ اسے اپنا حق دینے کو بھی تیار ہے۔

آج کے مروجہ عدالتی نظام میں لوگوں کے حقوق کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے، وکیل صاحبان کو اپنے موکل کے مجرم ہونے کا بخوبی علم ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات بھاری معاوضہ لیکر وہ ایسے مجرموں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور قانونی الفاظ کی اس طرح تشریح و تعبیر کرتے ہیں کہ جن سے ان کے موکلوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس طریقے سے بڑے بڑے مجرموں کو بری کرا لیا جاتا ہے۔ ایسے مجرم اور زیادہ بے باکی سے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جبکہ عدالتی نظام کا بنیادی مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے جرائم کا خاتمہ ہو لیکن موجودہ ناقص قسم کا عدالتی نظام، ان میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دن بدن جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔

عدالتی نظام کے ساتھ ساتھ اسلام اس امر کو بھی کوشش کرتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جائے کہ جس میں کوئی شخص دوسرے کی محنت کا استحصال نہ کر سکے۔ اور ہر ایک شخص کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملے۔ اور کوئی دوسرا شخص اسے اس کی محنت کے پھل سے محروم نہ کر سکے۔ دنیا کے ہر دور میں سود کا کاروبار، غریب محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اور یہ استحصال ابھی تک جاری ہے۔ اسلام نے سود کو اسلامی معاشرے کے خلاف سب سے بڑا جرم قرار دیا۔ قرآن مجید میں تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑائی کے برابر قرار دیا گیا۔ اس زمانے میں سرمائے کی سب سے بڑی صورت زمین کی بے حد و حساب ملکیت ہوتی تھی۔ ایسے مالک اپنی زمینوں کو غریب کاشتکاروں سے کاشت کراتے۔ انہیں پیداوار کا کچھ حصہ دیتے اور باقی گھر بیٹھے خود سمیٹ لیتے۔ رسول اللہ صلعم نے اس طرح کے کاشت کے معاملے کو خالص سود قرار دے دیا۔ اور زمین کے مالکوں کو یہ حکم دیا کہ وہ جتنی زمین اپنی ضروریات کے لئے کاشت کر سکتے ہیں، وہ اپنے پاس رکھیں اور اپنی

زائد زمین بلا قیمت ضرورت مند مسلمان بھائیوں کے حوالے رہیں۔ ورنہ اگر کوئی مالک زمین ایسا نہیں کرتا تھا تو وہ دوسرے لوگوں سے بھی اپنی زمین بٹائی کے اصول پر کاشت نہیں کرا سکتا تھا۔ اس طرح سے جو کوئی اپنی زمین کے کسی ٹکڑے کو تین سال تک آباد نہیں کر سکتا تھا اس پر سے اس کی ملکیت خود بخود ختم ہو جاتی تھی۔

اگرچہ اس زمانے میں زمین کی ملکیت ہی بہت زیادہ دولت جمع کرنے کا ذریعہ تھی اور آج بھی کسی حد تک اس ذریعہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم بعض لوگ سونے چاندی کی صورت میں بھی اپنی دولت جمع کر کے رکھتے تھے۔ انسان اگر اپنے آپ کو حلال کی کمائی تک محدود رکھے تھے تو پھر بہت کم لوگ دولت جمع کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے بھی یہ حکم ہوا کہ ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ جو دولت ہے اگر وہ سمیٹ کر رکھیں گے تو وہ ان کے لئے وبال جان بن جائیگی، اس لئے وہ اپنی ضرورت سے زیادہ دولت کو اپنے ضرورت مند بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے پر صرف کر دیں۔ سونے کے زیورات بھی اس زمانے میں اور آج بھی دولت جمع کرنے کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں، رسول اللہ صلعم نے مسلمان عورتوں کے لئے بھی سونے کے زیورات کا استعمال ممنوع قرار دے دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ صرف چاندی کے زیورات استعمال کریں کہ جو غریب لوگ بھی آسانی سے اپنے اہل خانہ کو مہیا کر سکتے تھے۔

اس طرح سے معاشرے سے استحصال اور اونچ نیچ ختم کرنے کے بعد اسلام نے ایک ایسا فلاحی معاشرہ قائم کر دیا کہ جہاں تمام لوگوں کی ضروریات زندگی احسن طریقے سے پوری ہونے لگیں۔ تو پھر جرائم میں بھی بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بد بخت کسی جرم کا ارتکاب کرتا تو شریعت اسلامی نے اس کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں جنہیں شرعی حدود کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اب جرائم کا ارتکاب صرف عادی مجرم ہی کر سکتے تھے اور انہیں معاشرے سے ختم کرنے کیلئے انہیں سخت سزائیں دینے کی ضرورت پیش آتی۔ لیکن روایات میں آتا ہے کہ سخت

قسم کے عادی مجرموں نے بھی اپنی اصلاح کر لی تھی اور رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں بہت کم لوگوں پر شرعی حدود کا نفاذ کیا گیا، عادی مجرموں نے اپنی اصلاح کس طرح کی اس کو وضاحت ایک مثال سے ہوگی۔ مدینہ منورہ کے قریب حواریں میں ایک نہایت ہی ظالم قسم کا مجرم رہتا تھا۔ جو چوری، ڈاکہ، زنا کاری اور قتل سب جرائم میں ملوث تھا۔ وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور تسلیم کیا کہ وہ ایک بہت بڑا مجرم ہے اور کوشش کے باوجود اپنے آپ کو جرائم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ آپ اس کے حق میں دعا فرمائیں کہ وہ جرائم کے ارتکاب سے باز آجائے۔ آپ نے دعا کے ساتھ اس سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ یہ وعدہ کرے کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا، ہمیشہ سچ کہے گا۔ چنانچہ وہ مجرم یہ وعدہ کر کے چلا گیا۔

رات کو جب ہی اسے کسی جرم کے ارتکاب کی خواہش ہوتی تو اسے فوراً رسول اللہ صلعم سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آجاتا۔ کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد جھوٹ تو بول نہیں سکتا تو اور رسول اللہ صلعم کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اس کی کیا حالت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس اقرار کے بعد آپ کو اس جرم کی سزا دیں، اس طرح آہستہ آہستہ وہ عادی مجرم صرف جھوٹ ترک کرنے سے تمام جرائم کے ارتکاب سے بچ گیا۔ آج بھی جھوٹ ہی جرائم کا منبع ہے اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اسی جھوٹ کی بنیاد پر عادی مجرموں کو سزا سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی اس لئے جرائم کی تعداد بھی کم ہو جائے گی۔

جہاں تک شرعی حدود کے نفاذ کا تعلق ہے تو شرعی سزائیں چونکہ سخت ہیں تو اس کیلئے نہ وری ہے کہ ان کے نفاذ سے پہلے اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جائے۔ رسول اللہ صلعم نے ایسا معاشرہ قائم کرنے کے بعد ہی ان سزاؤں کو نافذ کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما خیفہ دوم کے زمانے میں قحط کی وجہ سے اسلامی حکومت، اس معاشرے کو قائم نہ رہ سکی تو انہوں نے اس دوران چوری کی شرعی حد کے نفاذ کی

معطل کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ اسلامی معاشرے سے جرائم کے خاتمے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایسی فلاحی ریاست قائم کی جائے کہ جس میں معاشرے کے ہر فرد کی ضروریات مناسب طریقے سے پوری ہوں۔ اور کوئی طاقتور، غریب کی محنت کا استحصال کر کے دولت مند نہ بن جائے جیسا کہ سرمایہ داری نظام میں ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں ہی ظالمانہ نظام قائم ہے اسلام کے عدالتی نظام کو قائم کرنے کیلئے اس کی بجائے اسلامی نظام قائم کرنا ہوگا۔



## اسلام عدالتی نظام کے نفاذ کی ایک کوشش

اسلام آباد ۳۱ جنوری سینئر قاضی عبداللطیف اور مولانا سمیع الحق نے ۱۳ جولائی ۱۹۸۵ء کو سینٹ میں نفاذ شریعت بل ۱۹۸۵ء پیش کیا۔ بل کو پیش کئے جانے کے بعد متعلقہ قائمہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۸۵ء کو محرک کی طرف سے زبانی تحریک پیش کئے جانے کے بعد بل منتخبہ کمیٹی کو بھیج دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۵ء کی یہ بل منتخبہ کمیٹی کی پیش کردہ صورت میں سینٹ کے زیر غور لایا گیا بل حسب ذیل ہے۔

چونکہ قرار داد مقاصد کو جو کہ سابقہ و ساتپر میں بطور تمہید کے رکھی گئی تھی جناب صدر مملکت نے اپنے صدارتی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے دستور کا مستقل کا حصہ قرار دے دیا۔

اور چونکہ قرار داد مقاصد میں اس ملک کا حاکم اعلیٰ تشریحی اور تکوینی دونوں حیثیتوں سے رب العلمین خالق کائنات کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اور چونکہ یہ ملک مسلمانوں کی عملی زندگی کو قرآن اور سنت کے مطابق ڈھالنے کے لئے معرض وجود میں لایا گیا۔

اور چونکہ اس ملک کے باشندوں کے ساتھ یہ عہد کیا گیا کہ یہاں قرآن و سنت کا قانون زندگی کے ہر شعبے پر حاوی اور نافذ ہوگا اور چونکہ موجودہ ریفرنڈم اور



انتخابات میں عوام نے صدر مملکت اور پارلیمنٹ کو شریعت کے عملی نفاذ کیلئے منتخب کیا ہے۔

لہذا۔ اب بحسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے۔

۱۔ مختصر عنوان وسعت اور آغاز نفاذ (۱) یہ ایکٹ نفاذ شریعت ایکٹ ۱۹۸۵ء کے

نام سے موسوم ہوگا۔

۲۔ یہ پورے پاکستان پر نافذ ہوگا۔

یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ تعریف:- اس ایکٹ میں شریعت سے مراد۔

(الف) دین کا وہ خاص طریقہ ہے جس اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے۔

ج۔ کوئی حکم یا ضابطہ جو اجماع امت سے ثابت اور ماخوذ ہو۔ شریعت کا حکم

متصور ہوگا۔

د۔ ایسے احکام جو امت کے مسلمہ اور مستند فقہاء (مجتہدین) نے قرآن پاک

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت کے قیاس و اجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدون کئے ہیں شریعت کے احکام متصور ہوں گے۔

۳۔ کوئی مقننہ شریعت کے خلاف قانون نہیں بنائے گی۔ مقننہ کوئی ایسا قانون

یا قرار داد منظور نہیں کر سکے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو۔ اگر ایسا کوئی قانون یا قرار داد منظور کر لی گئی تو اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جاسکے گا۔

۴۔ ملک عدالتیں شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں گی ملک کی

عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی۔

۵۔ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار:- وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت

و فیصلہ بلا استثنیٰ تمام امور و مقدمات پر حاوی ہوگا۔

۶۔ شریعت کے خلاف احکامات دینے پر پابندی:- انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول

صدر مملکت اور وزیراعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔  
 ۷۔ عدالتی عمل اور احتساب۔ حکومت کے تمام اعمال بشمول صدر مملکت  
 اسلامی قانون عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔

۸۔ حذف کر دی گئی

۹۔ غیر مسلم کو تبلیغ کی آزادی۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو اپنے ہم مذہبوں  
 کے سامنے مذہبی تبلیغ آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی  
 قانون کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۰۔ علماء کہ حج مقرر کیا جائے گا۔ تمام عدالتوں میں حسب ضرورت تجربہ کار  
 جید اور مستند علماء دین کا بحیثیت حج اور معاونین عدالت تقرر کیا جائے گا۔

۱۱۔ ججوں کی تربیت کے انتظامات۔ علوم شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور  
 ججوں کی تربیت کا ایسا مؤثر انتظام کیا جائے گا کہ مستقبل میں علوم شرعیہ اور خصوصاً  
 اسلامی قانون کے ماہر جج تیار ہو سکیں۔

۱۲۔ قرآن و سنت کی تعبیر۔ قرآن اور سنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو اہل  
 بیت، عظام، صحابہ کرام اور مستند مجتہدین کے علم اصولی تفسیر اور علم اصول تفسیر  
 حدیث کے مسلمہ قواعد اور ضوابط کے مطابق ہو۔

۱۳۔ اعمال حکومت کے لئے شریعت کی پابندی۔ انتظامیہ عدلیہ مقننہ کے ہر  
 فرد کیلئے، ذرائع شریعت کی پابندی اور محرّمات شریعت سے اجتناب کرنا لازم ہوگا۔  
 ۱۴۔ ذرائع ابلاغ کی تطہیر۔ تمام ذرائع ابلاغ کو خلاف شریعت پروگراموں  
 فواحش اور منکرات سے پاک کیا جائے گا۔

۱۵۔ حرام کمائی پر پابندی۔ حرام طریقوں اور خلاف شریعت کاروبار کے ذریعہ  
 دولت کمانے پر پابندی ہوگی۔

۱۶۔ بنیادی حقوق کا تحفظ۔ شریعت نے جو بنیادی حقوق اہل ملک کو دیئے ہیں  
 ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا

## اغراض وجوہ

۳۔ بل کی اغراض وجوہ بھی حسب ذیل ہیں  
مملکت خداداد پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔  
اس کی بنیاد، اسلام کے نظریہ پر قائم ہے۔

اس مسودہ قانون کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ملک کے اسلامی نظریہ کا استحکام ہے۔

اہل ملک کو جو بلا امتیاز عرصہ سے اس نظام کیلئے بے چین ہیں مطمئن کرنا ہے۔  
ملک میں صحیح اسلامی معاشرہ کے ذریعہ امن و امان اور اسلامی مساوات قائم کرنا ہے۔

۱۴۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء کو منعقد ہونے والے سینٹ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بل پر تین ماہ کے اندر یعنی ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ء تک رائے عامہ حاصل کرنے کیلئے اسے مشترک کیا جائے۔

۱۵۔ عوام میں سے کوئی شخص یا کوئی ادارے یا انجمنیں وغیرہ جو بل کی تمام یا اس کی کسی دفعہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہوں وہ اپنی رائے سیکرٹری سینٹ سیکرٹریٹ سٹیٹ بینک بلڈنگ اسلام آباد کو زیادہ سے زیادہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ء تک بھیج سکتے ہیں۔

(فروری ۱۹۸۶ء)



## اسلام کا عدالتی نظام بازیچہ اطفال نہ بنایا جائے

حال ہی میں سینٹ کی جانب سے جو شریعت بل پاس کیا گیا ہے اور جس کے حوالے سے جمہوری حکومت کی نیت پر ابھی سے حملے کئے جا رہے ہیں اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بل کے مجوزین اور علم برداروں کو اسلام کے عدالتی نظام کی بنیادی اصطلاحات تک کا علم نہیں انہی اصطلاحات میں سے ایک قاضی اور مفتی کا فرق ہے۔ مفتی کسی بھی اسلامی دور میں کوئی سرکاری عہدہ نہیں رہا لیکن یہ حضرات اپنے بل میں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سرکاری مفتی مقرر کئے جائیں۔ اس سلسلے میں مجوزہ بل کی دفعہ ۴ کے تحت پوری چھ سفارشات کی گئی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

ایسے تجربہ کار اور مستند علماء جو اس قانون کے تحت مفتی مقرر کئے جانے کے اہل ہوں عدالتوں کے ججوں اور معاونین عدالت کے طور پر مقرر کئے جانے کے اہل ہوں گے۔

ایسے اشخاص جو پاکستان یا بیرون ملک اس مقصد کے لئے متعلقہ حکومت کے تسلیم شدہ اسلامی علوم کے معروف اداروں سے شریعت کا واضح علم رکھتے ہوں۔  
فی الوقت نافذ کسی دوسرے قانون میں شامل کسی امر کے باوجود شریعت کی

تشریح اور تعبیر کے لئے عدالت کے سامنے اس مقصد کے لئے وضع کئے جانے والے قواعد کے مطابق پیش ہونے کے اہل ہوں گے۔

مفتی جس کا درجہ ڈپٹی ایٹارنی جنرل کے برابر ہو گا کا یہ فرض ہو گا کہ وہ ایسے قانونی امور کے بارے میں جن پر شریعت کی تشریح و تعبیر درکار ہو مشورہ دے۔ اور ایسے دیگر فرائض انجام دے جو حکومت کی طرف سے اس کے سپرد یا اس کو تفویض کئے جائیں اور اسے حق حاصل ہو گا کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ میں جب کہ وہ اس قانون کے تحت اختیار سمت استعمال کر رہی ہو وہ وفاقی عدالت میں سماعت کے لئے پیش ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بل کے مجوزین حضرات کو قاضی اور مفتی کے فرق کا علم نہیں تھا قاضی اسلامی حکومتوں میں ایک سرکاری عہدہ ہوتا تھا جب کہ مفتی کا نہ تو کوئی سرکاری عہدہ ہوتا تھا اور نہ ہی کسی مسلمان حکمران نے سرکاری طور پر کبھی مفتیوں کا تقرر کیا۔ مفتی کے لفظی معنی ہیں فتویٰ دینے والا، لوگ ان سے اپنے طور پر شرعی مسائل کے بارے میں رائے پوچھتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی ادوار میں مسلمانوں کے درمیان جب تنازعے پیدا ہوتے وہ عدالتوں میں قاضیوں کے پاس جانے کی بجائے انہیں خود ہی نمٹانے کی کوشش کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ یہ دیکھتے تھے کہ ان کے علاقے میں سب سے بڑا عالم دین کون سا ہے وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے تنازعے کا ذکر کئے بغیر وہ اس سے اس قسم کے تنازعے کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرتے اور پھر خاموشی سے اس حکم پر عمل کر کے تنازعہ کو ختم کر دیتے تھے وہ عوام میں مفتی کے نام سے مشہور ہو جاتا تھا۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس اصول پر عمل کرتے تھے اپنے تنازعات کا ذکر کئے بغیر رسول اکرم سے اس قسم کے معاملات کے بارے میں شریعت اسلامی کا حکم معلوم کرتے اور پھر چپکے سے اس پر عمل کر لیتے خود ہمارے اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے بعض لوگوں کی کمی

نہیں جو عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے کی بجائے ایسے علماء جو مفتی کہلاتے ہیں، سے شرعی حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرتے ہیں مختصر یہ کہ مفتی اسلامی تاریخ کے کسی دور میں سرکاری عہدہ نہیں رہا بلکہ یہ ہمیشہ ایک غیر سرکاری شخص ہوتا تھا جو لوگوں میں مفتی کے نام سے مشہور ہو جاتا۔ اور چونکہ سرکاری اثر و رسوخ سے آزاد ہوتا اس لئے حکومتیں اگر غلط کام کرتیں تو ان کے خلاف بھی فتوے جاری کر دیتا تھا۔ شریعت بل کے مجوزین کو اگر قاضی اور مفتی کا یہ فرق معلوم نہیں تھا تو وہ کم از کم اپنے زمانے کے ایک مفتی کے مقام پر غور کر لیتے ہمارا اشارہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی طرف ہے ان کے فرقے کے علماء حضرات کی جانب سے انہیں مفتی اعظم پاکستان کا خطاب دیا گیا تھا حالانکہ نہ تو وہ حکومت پاکستان کے کوئی عہدہ دار تھے اور نہ ہی حکومت نے انہیں یہ خطاب دیا تھا۔ علماء حضرات انہیں مفتی اعظم اس لئے کہنے لگے کہ عوام کی اکثریت ان سے درپیش ہونے والے مسائل کے بارے میں شریعت اسلامی کا حکم معلوم کرتی تھی اور اس پر اپنے طور پر عمل کر لیتی تھی۔

اب شریعت بل کے تحت مفتی کا سرکاری عہدہ قائم کیا جا رہا ہے یعنی ایسا عہدہ جس کا پچھلے چودہ سو سال میں کسی اسلامی ملک میں وجود نہیں رہا پھر اس عہدے کے لئے جن علماء حضرات کو موزوں قرار دیا جا رہا ہے ان کی علمیت کا راقم کو بڑا ہی تلخ تجربہ ہے وہ یوں کہ جنرل ضیاء الحق نے مولوی حضرت کی جانب سے ان کے مارشل لاء کی تائید کے عوض میں ان کے مدارس کی درس نظامی کے سند کو ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کی ڈگری کے برابر قرار دے دیا اس طرح وہ کالجوں میں لیکچراروں کے طور پر منتخب ہونے کے اہل قرار دے دیئے گئے۔ اتفاق سے اس فیصلے کے بعد کالجوں کے لئے عربی اور اسلامیات کے لیکچراروں کی بھرتی کے لئے جو انٹرویو ہوئے اس کی ذمہ داری راقم کو سونپی گئی پچھلے تین چار سال میں تین چار ہزار سے زائد ان علماء حضرات کا انٹرویو لینے کا اتفاق ہوا یہ حضرات شریعت اسلامی کا علم تو کجا اپنی درس

نظامی والی عربی ڈگری کا اردو میں ترجمہ نہیں کر سکتے تھے۔ اتفاق سے ان کے درس نظامی کی ڈگری شہادہ العالمیہ کی ترکیب عربی زبان کی گرائمر کے مطابق غلط تھی۔ اس لئے وہ بیچارے اس کا غلط ترجمہ کرتے رہے پھر انہیں بتایا گیا کہ ان کی ڈگری کے عنوان میں عربی زبان کے مطابق ایک سنگین غلطی ہے لیکن وہ اس غلطی کی نشاندہی نہ کر سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

درس نظامی میں علامہ بیضاوی کی تفسیر شامل ہے ان حضرات سے اس تفسیر کے حوالے قرآن مجید کی پہلی آیت کا ترجمہ پوچھا گیا تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں کوئی بھی اس کا صحیح ترجمہ نہ کر سکا جہاں تک قاضی کے عہدے کا تعلق ہے تو بلاشبہ اسلامی حکومتوں میں یہ ایک معزز عہدہ رہا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے ایسے جید علماء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں جنہیں اس زمانے کے تمام فقہی ذخیرے پر مکمل عبور حاصل ہوتا تھا اور ہمارے علماء کی جو علمی حالت ہے اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جنرل ضیاء صاحب نے مارشل لاء کی تائید کے بدلے میں مولوی حضرات سے ایک وعدہ یہ بھی کیا تھا کہ وہ جلد ہی علماء حضرات کو ملک کی عدالتوں میں قاضی مقرر کر دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس عہدے کے لئے مطلوبہ لیاقت حاصل کریں چنانچہ ان کے اشارے پر قاضی تیار کرنے کے لئے مختلف دینی مدارس میں قاضی کلاسیں شروع کی گئیں ان میں سب سے اعلیٰ ادارہ فیصل آباد کا شریعت کالج تھا جو فیصل آباد کے تین دینی مدارس کے تعاون سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ مدارس جامعہ تعلیمات اسلامی دارالعلوم اسلامیہ اور جامعہ سلفیہ تھے۔ اس منصوبے کو حکومت کا تعاون بھی حاصل تھا اور قاضی کا کورس کرنے والے امیدواروں کو سرکاری فنڈز سے وظیفے دیئے گئے اس کالج کا افتتاح پنجاب کے گورنر نے اپنے دست مبارک سے کیا تھا۔

اس کالج کی پہلی کلاس علماء اور وکلاء حضرات پر مشتمل تھی انہوں نے اس

کالج میں چار ماہ کی تربیت حاصل کی اور پھر بعد میں کامیاب طلباء کو مزید تربیت کے لئے سعودی عرب بھیجا گیا اب جو شریعت بل میں قاضی کے عہدے کے لئے جن ضروریات کا تعین کیا گیا ہے ان کے مطابق یہ لوگ اس ملک میں قاضی بننے کے اہل ہیں لیکن عملاً یہ حضرات شریعت اسلامی سے بالکل نابلد ہیں۔

اسلامی فقہ جسے اسلامی قانون کہا جاتا ہے کی ڈیڑھ ہزار متداول کتابیں ہیں لیکن قاضیوں کی تربیت کرنے والے اس کالج کے نصاب میں ان میں سے ایک کتاب بھی شامل نصاب نہیں کی گئی تھی فقہ کی ایک چھوٹی سی کتاب بدایتہ المجتہد کے صرف چند صفحات داخل نصاب کئے گئے اور وہ بھی مولوی حضرات کے لئے وکلاء حضرات اس سے مشنی تھے یعنی قاضی کے عہدے کے لئے جن لوگوں کو تیار کیا جا رہا تھا انہیں اسلامی قانون کی ایک بھی کتاب نہیں پڑھائی گئی حالانکہ اس مقصد کے لئے دوسرے ممالک میں آٹھ زندہ فقہی مذاہب کی درجنوں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

سارا نصاب چند لیکچراروں پر مشتمل تھا اور کلاس کے خاتمہ پر جو امتحان ہوا اس کے پرچے ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قاضی کورس کے اساتذہ کو اسلامی قانون کی مبادیات تک کا علم نہ تھا مثلاً اجتہاد کے بارے میں ان قاضیوں سے یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ اجتہاد کا دروازہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوا اور جو لوگ ایسا کہتے ہیں تو اس کی وجہ ان کی اسلامی فقہ اور اسلامی قانون سے جہالت ہے ابھی کل کی بات ہے کہ اسلامی معاشرے میں سگریٹ نوشی کا رواج ہوا جس کے بارے میں اسلامی قانون کی کتابوں میں کوئی حکم موجود نہیں تھا تمام اسلامی ممالک کے علماء نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس نئے پیدا ہونے والے مسئلہ کا جائزہ لیا اور حیرانی کی بات ہے۔ کہ وہ سب ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ یہ شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہو سکتا چنانچہ ان سب نے سگریٹ نوشی کے حرام ہونے کا متفقہ فتویٰ صادر کر دیا۔

اگر حکومت اس ملک میں اسلام کا عدالتی نظام نافذ کرنا چاہتی ہے تو پھر اسے



موجود لاء کالجوں میں اسلامی قانون کی چند مستند کتابیں اس کی اصلی عربی زبان میں پڑھانے کا انتظام کرنا چاہیے وگرنہ جس طرح کے قاضی تیار کئے جا رہے ہیں اس سے اسلام کا عدالتی نظام بازیچہ اطفال بن جائے گا جس سے عامتہ الناس اسلام سے بھرتنفر ہوں گے۔

(جون ۱۹۹۰ء)



## اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کو خواہش

ملک عزیز میں اس وقت ہمارے سابقہ انگریز حکمرانوں کا نافذ کردہ عدالتی نظام ہی جاری و ساری ہے۔ ایک تو یہ نظام مہنگا ہے دوسرے اس کے ذریعے لوگوں کو انصاف حاصل کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض اوقات اگر انصاف ملتا بھی ہے تو بہت دیر سے۔ اس لئے کافی عرصے سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہاں اسلام کا عدالتی نظام نافذ کیا جائے۔ موجودہ حکومت کو بھی اس کا احساس ہے اور وہ اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کے بارے میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس بارے میں سب سے بڑی روکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے اکثر قانون دانوں کو اسلام کے عدالتی نظام سے مناسب واقفیت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں قانون کو جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے نصاب میں اسلامی قانون کی کوئی مستند کتاب شامل نہیں ہے۔

اس کمی کو پورا کرنے کیلئے راقم پچھلے چالیس سالوں سے متعلقہ حضرات کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا رہا ہے کہ قانون کو تعلیم میں داخلے کیلئے عربی زبان سے واقفیت کو بنیادی شرط قرار دیا جائے اور یہ کہ قانون کے نصاب میں اسلامی قانون کی کوئی مستند کتاب شامل کی جائے۔ لیکن ابھی تک میری اس تجویز کو قبولیت حاصل

نہیں ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ایسے قانون دان جو اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کے دلی خواہشمند ہیں وہ بھی اس کی تفصیلات سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہے۔ اور اسلام کے عدالتی نظام کی تعریف کرتے ہوئے بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں کہ جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

مثلاً ان میں سے اکثر حضرات یہ دعوے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ یا نائب بنا کر بھیجا ہے اور اسے اپنے کچھ اختیارات تفویض کئے ہیں کہ جن کے مطابق وہ فیصلے کرے۔ حالانکہ سرے سے یہ عقیدہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تھے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ علامہ الماوردی نے اس امر پر امت مسلمہ کے تمام علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ جو کوئی بھی یہ عقیدہ رکھے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے وہ فاسق و فاجر ہے (احکام السلطانیہ ۱۵) امام ابن تیمیہ نے اس عقیدے کو سراسر کفر قرار دیا ہے۔ (الفتاویٰ الکبریٰ جلد دوم صفحہ ۵۵۳)

ان حضرات کی دوسری سنگین غلطی اسلامی قانون کی مشہور اصطلاح اجتهاد کے بارے میں ہے۔ ان کے خیال کے مطابق قدامت پسند علماء حضرات نے اجتهاد کا دروازہ بند کر دیا تھا جسے اب کھولنے کی ضرورت ہے اور پھر اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت کی بنا پر اجتهاد کا اطلاق ایسے مسائل پر کرتے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود ہیں یہ چونکہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کو وضاحت ایک مستقل مکالمے میں کی گئی ہے جو آئندہ سطور میں قارئین کے سامنے آجائے گا۔

اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں روزنامہ جنگ نے اس نظام سے دلچسپی رکھنے والے قانون دانوں کے خیالات کا ایک سروے شائع کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ قارئین کی دلچسپی کے لئے آئندہ صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔

## وکیل انجم

انصاف مسلم معاشرے کا طرہ امتیاز رہا ہے تاریخی واقعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہر زمانے میں اسلام کے فرزندوں نے سماجی انصاف کا بول بالا کیا اور سب سے زیادہ خیال حقوق انسانی اور عدل و انصاف کا ہی رکھا ہے جس کی مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ ہے جو بنی نوع انسان کے لئے مساوات کا درس بھی ہے اور جامع دستاویز بھی۔ اسلام نے ایسے معاشرے کو جنم دیا جو صراط مستقیم پر گامزن ہے۔ اس معاشرے کا ہر فرد نیکی کا گرویدہ اور بدی سے بچنے والا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی نیک کام کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا) کو اپنا فرض منصبی بنا کر اسلامی معاشرہ ”امت وسط“ کے لقب کا مستحق ہوا ہے دنیا میں عدل اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب برائی کو روک دیا جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے۔ انصاف کی بدولت ہی دنیا کے نظم و نسق میں بہتری پیدا ہو سکتی ہے اسلامی معاشرہ دنیا کی تاریخ میں واحد مثال ہے جس میں لوگ صلح و آشتی اور امن و امان کے ساتھ بستے تھے اور تمام شہریوں کو مساویانہ شہری حقوق حاصل تھے۔ سیاسی معاملات اور تجارتی لین دین میں کمی بیشی کرنے کے عمل کو اسلام نے سختی سے منع کیا ہے۔ قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لئے اشیاء کو بازار سے ناپید کر دینا سخت گناہ قرار دیا۔

”تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی آچکی ہے تو تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ پیدا کرو، اگر تم صاحب ایمان ہو تو سمجھ لو کہ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔“  
(الاعراف ۸۵)

ان سماجی خرابیوں کو روکنے کے لئے عدالتی نظام کو بھی اسلامی معاشرے میں استحکام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ نظام عدل مسلمان حکمرانوں کے

نظم و نسق کا ایک ضروری جز رہا ہے۔ جب دنیا میں پہلی اسلامی مملکت بنی تو یہ ایک نئے تصورات حیات اور ایک بلند نصب العین کے ساتھ قائم ہوتی تھی اس کا اولین مرکز مدینہ تھا جہاں مکہ کے مہاجر، مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے غیر مسلم عرب اور یہودی سب ہی اس مملکت میں شامل تھے۔ اس مملکت کا دستور تحریری شکل میں منظر عام پر آیا اور یہ اسلام کی پہلی مملکت تھی جو سیاست کے بلند تصورات کے ساتھ قائم ہوئی اس میں عدل کو سب سے زیادہ مقام حاصل تھا اگرچہ ہر قوم اور ہر تہذیب میں انصاف کا تصور مختلف رہا ہے اور یہ تصور حالات، زمانے اور جگہ کے مطابق بدلتے رہے بلکہ ہر قوم اور زمانے نے ”عدل“ کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھا اور یوں سزا کا تصور بھی بدلتا رہا اس کے ساتھ ساتھ ججوں کے معیارات اور مختلف معاملات میں فیصلے بھی مختلف رہے ہیں جبکہ کتاب اللہ میں ”عدل“ کا تصور بہت بلند ہے تمام اسلامی قوانین ایک مربوط نظام عدل کا حصہ ہیں۔ ان میں سے بعض کو اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑ دینا درست نہیں کیونکہ.....

حد زنا مسلم معاشرے میں گناہ کبیرہ ہے اس حد کا اسلام کے عائلی قوانین سے گہرا تعلق ہے اسلام نے نکاح کے قانون میں وسعت اور گنجائش رکھی ہے ایک آدمی حسب حالات و شرط عدل ایک وقت میں چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس قانونی وسعت کے باوجود اگر کوئی زنا جیسے جرم کا مرتکب ہوگا تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

اسلامی نظام عدل میں جہاں جرائم کی سخت سزاؤں کا حکم دیا گیا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ قاضی کو اس بات کی اچھی طرح تسلی کر لینی چاہیے کہ وہ جس جرم کی سزا سنا رہا ہے وہ شہادتوں اور دلائل کے مطابق ہے۔ اگر جھوٹی شہادتوں کی بنیاد پر سزا دے بھی دی جائے اور بعد میں اصل مجرم سامنے آجائیں تو قاضی کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

## جسٹس (ر) شفیع محمدی

اسلام میں انصاف کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ عدالت کسی بھی شخص کے خلاف اس کا موقف سے بغیر فیصلہ نہ دے اس اصول کا اظہار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان سے بھی ہوتا ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اس فرمان کو ابو داؤد نے اپنی سنن میں، ترمذی نے اپنی جامع میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ.....

”جب دو فرد تمہارے پاس کوئی مقدمہ لائیں تو تمہیں فیصلہ کسی ایک شخص کے حق میں نہیں کرنا چاہیے جب تک تم دوسرے کی بات نہ سن لو کیونکہ دونوں کو سننے کے بعد ہی تم صحیح فیصلہ کر سکتے ہو۔“

اسلام کی ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایسے جج ضرور سوچیں جو مقدمے کے کسی ایک فریق کی غیر حاضری پر عموماً ”ایکس پارٹی“ آرڈر دوسرے فریق کے حق میں کر دیتے ہیں چاہے دوسرے فریق کا مقدمہ کتنا ہی کمزور ہو اور جس کے خلاف آرڈر کیا جاتا ہے اس کا مقدمہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ اسلام میں انصاف کا دوسرا اصول ہے کہ ہر شخص چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر سب قانون کی نظر میں برابر ہیں اسی اصول کی تشریح صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج شدہ چوری کے ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ عرب کے ایک بااثر قبیلہ بنو مخزومہ کی ایک عورت چوری کے ایک کیس میں پکڑی گئی۔ قرآن مجید کے حکم کے مطابق اس کی سزا کڑی تھی قریشی بہت پریشان تھے کیونکہ بنو مخزومہ جیسے بااثر قبیلہ کی عورت کو سزا دینے کے سیاسی طور پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ معاملہ چونکہ بڑا حساس تھا اس لئے بڑے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ حضرت اسامہ بن زید کو سفارش کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا جائے کیونکہ صحابہ کرام کا یہ خیال تھا کہ آپ ان کی بات نہ ٹالتے تھے تاہم یہ سفارش رد کر دی گئی عورت کو سزا

دی گئی اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بے شک تم سے پہلے قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ سزا کا اطلاق بااثر لوگوں پر نہیں کرتی تھیں، اگر وہی جرم کوئی مجبور شخص کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کے ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور ایک یہودی کے مابین ایک مقدمہ ایک قاضی کے سامنے پیش ہوا تو قاضی حضرت عمرؓ کے احترام میں کھڑا ہو گیا حضرت عمرؓ نے اس بات کو ناقابل معافی قرار دیا کیونکہ قاضی کا یہ فعل اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ مقدمہ سنتے وقت اس نے حضرت عمرؓ اور اس کے مخالف کے ساتھ برابر کا سلوک روانہ رکھا تھا چنانچہ عدالتی معاملات میں مساوات کے آفاقی اصول کو نظر انداز کرنے کی بنیاد پر خلیفہ وقت نے جو حکمران بھی تھے فوراً انہیں ہٹا دیا۔

اسلام میں انصاف کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ کوئی حج کسی ایسے مقدمے کا جس میں اس کا بالواسطہ یا براہ راست تعلق ہو خود فیصلہ نہیں کر سکتا اسلام کا یہ اصول بھی آفاقی ہے اسلام کے اس اصول پر بھی آج پوری دنیا میں عمل کیا جاتا ہے۔ مدینہ کی مملکت کے قیام کے بعد دنیا کا پہلا تحریری آئین (میشاق مدینہ کی صورت میں) مرتب کیا گیا جس پر ہر مشہور قبیلے کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے اس آئین کی روشنی میں مدینہ کے تمام قبائل، مہاجر، انصار اس بات کے پابند تھے کہ اگر مدینہ پر کہیں سے حملہ ہوگا تو وہ سب اس کی حفاظت کریں گے۔ قبیلہ بنو قریظہ بھی اس آئین کا پابند تھا۔ اسی آئین کے تحت تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل تھے۔

حضرت عمرؓ بحیثیت خلیفہ قاضی بھی تھے ان کا اختلاف ایک مسئلے میں حضرت ابی بن کعبؓ سے ہوا تو انہوں نے اس کا فیصلہ خود نہیں کیا بلکہ اس مقدمہ کو حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس لے جایا گیا۔ حضرت علیؓ خود خلیفہ ہونے کے ناطے ت مملکت کے چیف قاضی بھی تھے انہوں نے اپنے ماتحت قاضیوں

کے کئی غلط فیصلے بدل دیئے اسلام میں قاضی کے لئے یہ اصول طے کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسے مقدمے کا فیصلہ خود نہیں کر سکتا جس میں وہ بالواسطہ یا براہ راست ایک فریق کی حیثیت رکھتا ہو یا اس سے کسی قسم کا اس کا تعلق ظاہر ہوتا ہو فقہ کی تمام کتابوں میں بھی اس اصول کو پوری طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے فقہ کی مشہور کتاب معین الحکام کے صفحہ ۳۵ پر اس سلسلہ میں جو عربی عبارت درج ہے اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے ”قاضی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کیس کا فیصلہ اپنے حق میں کرے یا ان لوگوں کے حق میں کرے جس میں وہ گواہ نہیں بن سکتا کیونکہ انصاف کا انحصار گواہی پر ہے جب وہ کسی کیس میں گواہی نہیں دے سکتا تو اس کیس میں فیصلہ بھی نہیں کر سکتا۔“

اسلامی نظام عدالت میں سب سے بڑا نجاتی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی ذات نے یہ کام انبیاء کرام کے سپرد کیا۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں یہ کام اپنے صحابہ کے سپرد کیا لیکن چونکہ قضا کی اصل ذمہ دار آپؐ پر تھی اسی لئے آپؐ اپنے قاضیوں کے فیصلوں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ تواریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور میں گورنروں اور قاضیوں کو ہر سال حج کے موقع پر مکہ بلائے اور عوام کے سامنے ان کی کارکردگی کے متعلق پوچھتے تھے صرف ایک سال آپؐ خود ایسا نہ کر سکے مگر اس سال بھی آپؐ نے ایک صحابی کو اس مقصد کے لئے مقرر کیا۔

سید افضل حیدر ایڈووکیٹ

اسلام میں قاضی یا جج کی بڑی اہمیت ہے اس کے بغیر ”نظام عدل“ قائم نہیں ہو سکتا جج یا منصب مکمل طور پر قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلے کرنے میں آزاد ہوتا ہے انتظامیہ یا حکومت اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتی کیونکہ وہ انتظامیہ سے مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے قاضی نے فیصلہ حقائق، شہادتوں، براہین اور احکام الہی کے



مطابق کرنا ہوتا ہے اسلام میں حج یا قاضی کے فیصلہ کے خلاف اپیل بھی کی جاسکتی ہے جب فیصلہ حتمی ہو جائے تو انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اسے نافذ کرے۔

حصول انصاف معاشرے کا بنیادی رکن ہے کیونکہ ”عدل“ اسلام کا اہم رکن ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ فیصلہ کرنے والا مکمل طور پر آزاد ہو اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہونا چاہیے حکمرانوں کی طرف سے مداخلت یا دباؤ قرآن و سنت کے احکامات کے بھی منافی ہے قاضی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ وہ انصاف اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرتا ہے اگر کوئی قاضی بیرونی مداخلت یا دباؤ کو قبول کرتا ہے نہ صرف وہ یہ کہ قرآنی احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے بلکہ وہ انصاف کا خون بھی کرتا ہے اور ایسا قاضی منصف کے عہدے سے خارج تصور ہوگا جہاں تک گواہ کا تعلق ہے اس کی گواہی قرآن و حدیث کے اصولوں پر پوری اترتی ہو عدالت نے فیصلہ گواہوں کی روشنی میں کرنا ہوتا ہے اگر گواہی دینے والا جھوٹا ثابت ہو جائے تو اسلام میں جھوٹا شخص گواہی دینے کے لئے ہمیشہ کیلئے نااہل ہو جاتا ہے اور اسلام میں کسی کیلئے یہ سب سے بڑی سزا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں یہ تحریک پیدا کی جائے کہ وہ سچی گواہی دیں جہاں تک جرائم کے خاتمہ کے لئے ایک وکیل کا تعلق ہے اس کا کام اہم نوعیت کا ہوتا ہے وکیل عدالت کو صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دے گا وکیل عدالت، ثبوت اور گواہوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے وکیل فریقین کے درمیان امن، صلح، رواداری قائم رکھنے کے لئے تمام بوجھ اپنے اوپر لیتا ہے اور حصول انصاف میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

رانا اختر علی ایڈووکیٹ

اسلام میں اقتدار اعلیٰ شخصی نہیں بلکہ خالق کائنات ذات برحق خدا تعالیٰ کو ہی حاصل ہے قرآن کریم نے اقتدار اعلیٰ کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق انسان دنیا میں خدا تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے وہ زمین پر خدا کے عطا کردہ اختیارات استعمال کرتا

ہے۔ حاکمیت کے اعلیٰ و مسلم اصولوں کے مطابق عدل اسلامی حکومت کا مستقل اور اہم شعبہ ہے اس کا نام ”صیغہ قضا“ ہے۔ عدل ظلم کی ضد ہے عدل یہ ہے کہ حق دار کو حق دلایا جائے اور جس کا حق نہیں اس سے حق لیا جائے۔ ”صیغہ عدل“ اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کے حقوق، امن، آزادی اور مساوات کا محافظ ہے۔ قاضی کا فرض ہے کہ وہ حق کے ساتھ میزان عدل کے دونوں پلڑے سونی صد برابر رکھے۔ نظام عدل کو اسی لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے سامنے مملکت کا ہر انسان جواب دہ ہے اور برابر ہے۔ اسلامی نظام عدل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف حاکم، عدالت، وکیل اور قاضی کو عادل ہونا چاہیے بلکہ گواہ بھی عادل ہو یہ خوبی دنیا کے کسی نظام عدل میں نہیں پائی جاتی۔

اس کے علاوہ اسلام کے زیریں اصولوں کو مد نظر رکھتا ہو۔ قاضی کے لئے سب سے اولین فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت صریح قرآنی احکام یا مسلمہ یا مشہور حدیث یا اجماع کی پیروی کرے۔ قاضی ہمیشہ اپنے عدالتی صوابدیدی اختیارات کا استعمال ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق کرتا ہے۔ اگر قاضی قرآن و حدیث کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنے میں مشکل کا شکار ہو یا مقدمہ میں اس کا کسی قسم کا تعلق ظاہر ہو رہا ہو تو وہ مقدمہ دوسرے قاضی کو منتقل کرنے کی درخواست کر سکتا ہے۔ اسلام میں قاضی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی قسم کے دباؤ سے آزاد رکھے اور کمزور کے مقابلے میں طاقت ور کو اہمیت نہ دے۔



## انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہے

پچھلے چالیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام شائع کیا جا رہا ہے جس کی اس وقت تک کوئی بیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ راقم کو پہلے یہ کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کتاب کا انگریزی نسخہ میری ذاتی لائبریری میں موجود تھا۔ ان دنوں مجھے برصغیر کی اسلامی ریاست بھوپال کی اسلامی خدمات کی تفصیلات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کی۔ اس کے بارے میں کسی زمانے میں یہ الزام لگا تھا کہ یہ پورپ میں تیار کردہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا ترجمہ ہے لیکن اس الزام کی تردید میں متعلقہ ادارے کی جانب سے وضاحت کی گئی تھی کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اس میں اسلام کے بارے میں بہت سی مزید معلومات دی جا رہی ہیں جو انگریزی ایڈیشن میں نہیں۔ ریاست بھوپال نے برصغیر میں اسلامی علوم کی جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ شاید ہی دنیا کے کسی اسلامی ادارے نے اتنی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اسی ریاست میں تین سو علماء کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جنہوں نے اسلامی علوم پر سینکڑوں کتابیں مرتب کیں جو ریاست کے خرچ پر شائع کر کے برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں مفت تقسیم کی گئیں۔ ریاست بھوپال نے یہ دینی

خدمات ایک مسلمان حکمران عورت ملکہ شاہ جہان کے عہد زریں میں سرانجام دی تھیں لیکن پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ اسلامی ریاست بھوپال کی اسلامی خدمات تو کجا، سرے سے اس اسلامی ریاست کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یا تو ایسا دانستہ کیا گیا کیونکہ اس سے اسلام میں مسلمان عورت کی حکمرانی کا جواز ثابت ہونا تھا، یا پھر اہل علم کا یہ الزام درست دکھائی دیتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کا انسائیکلو پیڈیا انگریزی ایڈیشن کا ترجمہ ہے۔

اگر یہ یورپ میں شائع شدہ انگریزی انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ ہے، تو پھر یہ ترجمہ بھی ناقص ہے۔ کیونکہ اصل کتاب میں جو مضمون صحیح صحیح بیان کیا گیا ہے ترجمے سے اس کو غلط بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید، میں حضرت آدم علیہ السلام کے سلسلے میں جس لفظ کا ذکر ہے انگریزی انسائیکلو پیڈیا میں تو اس کے صحیح معنی بیان کئے گئے یعنی نائب یا پیچھے آنے والا اور بس اور پھر ان معانی کی روشنی میں خلیفہ کے لفظ پر مفصل بحث کی گئی ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلو پیڈیا میں انسان یا آدم کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ثابت کیا گیا ہے اور متعلقہ آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے

”میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔“ (یہاں اس ترجمے میں ’اپنا‘ کا لفظ اپنی جانب سے اضافہ کیا گیا ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید کے کسی لفظ کا ترجمہ نہیں) پھر فرماتے ہیں کہ خلیفہ کے لغوی معنی ہیں پیچھے آنے والا یا نائب، قرآن مجید میں مذکورہ مفہوم کے ضمن میں ایک نیا مفہوم خلافت بمعنی نیابت الہی نکلا ہے (جلد ہشتم ص: ۹۸۸)

اسلام میں نیابت الہی کا عقیدہ سب سے پہلے تصوف کے امام شیخ ابن عربی نے پیش کیا تھا اور اس کی بنیاد ان کا وحدہ الوجود کا عقیدہ تھا یعنی انسان اور اللہ تعالیٰ کا نعوذ باللہ، ایک وجود ہے۔ علمائے اسلام نے اسے رد کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حی و قیوم ہے جو ہر جگہ موجود ہے جبکہ خلیفہ ایسی ذات کا بنایا جاتا ہے جو موجود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ نے یہ

فوقی اور نیا تھا کہ جو کوئی کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ مجھے گا وہ مشرک اور کافر

۔

(النتاوی الکبری جلد دوم ص ۵۵۳)

علامہ الماوردی نے اس بارے میں یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ جو انسان یہ عقیدہ رکھے کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو اس کے فاسق و فاجر ہونے پر علمائے امت کا اتفاق ہے۔ (احکام السلطانیہ صفحہ: ۱۵) حیرت کی بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ انسائیکلو پیڈیا میں اس غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور غلطی سامنے آئی وہ یہ کہ سارے انسائیکلو پیڈیا میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درود کی وہ عبارت استعمال کی گئی ہے جو عربی زبان کی گرامر کے مطابق غلط ہے عربی زبان کی گرامر کے امام سیبویہ نے اسے ایک بہت ہی قبیح غلطی قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ سلف صالحین سے درود کی جو عبارت منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: صلی اللہ علیہ وسلم

بعد میں کچھ لوگوں کی جانب سے اس میں الہ کا اضافہ کر کے یوں پڑھا جانے لگا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ چونکہ یہ ترکیب عربی زبان کے مطابق غلط تھی۔ عربی زبان میں مجرور ضمیر پر اسم ظاہر کا عطف نہیں ہو سکتا۔ اس عبارت میں علیہ ضمیر مجرور ہے جبکہ ”الہ“ اسم ظاہر ہے چنانچہ نحو کے امام سیبویہ نے فرمایا کہ اگر الہ کا اضافہ کرنا ہے تو اس سے پہلے حرف جار ”علی“ کو دوبارہ لایا جائے تو پھر درود کی عبارت ٹھیک ہو جائے گی اور یہ یوں پڑھا جائے گا:

صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم

کچھ لوگ جو آل کو نبوت میں شریک سمجھتے تھے۔ عربی عبارت کی اس اصلاح کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ”علی“ کے بغیر درود کو مروج کیا۔ اس لیے اگر اس کے استعمال کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس غلطی سے عقیدہ ختم نبوت پر زد پڑتی

ہے۔ پنانچہ سیبویہ نے ان حضرات کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اپنے دعوے کی دلیل میں قرآن و حدیث کی کوئی عبارت پیش کریں جسے پیش نہ کیا جاسکا۔

اس موضوع پر خود ہمارے اخبارات میں پچھلے آٹھ دس سال سے بحث ہوتی رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو انسائیکلو پیڈیا اسلام کے مرتبین میں شاید عربی کا ذوق نہیں ورنہ یہ غلطی ان پر واضح ہو جاتی نہ ہی وہ اس بحث سے آگاہ ہیں جو اخبارات میں چلتی رہی ہے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام کے بارے میں صحیح صحیح معلومات پیش کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے اور اس ضمن میں ہر ممکن احتیاط برتنی چاہیے۔

خلیفہ کے بارے میں راقم کی تحقیق اخبارات میں شائع ہوئی۔ تو حکومت نے اس کی روشنی میں قرارداد مقاصد میں بھی ترمیم کر دی۔ جس کے بارے میں تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔

پاکستان کے لئے دستور میں قرارداد مقاصد کے پہلے پیرے میں ایک اہم ترمیم عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ ترمیم جو مولانا کوثر نیازی وزیر اطلاعات و نشریات اوقات و حج کی جانب سے پیش کی گئی تھی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ اپنی حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات کسی کو تفویض کرتا ہے، اسلامی عقیدہ توحید کے سلسلے میں غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی ترمیم پر لفظ (DELEGATED) یعنی اختیارات کی تفویض کے لفظ کو حذف کر دیا گیا۔ علماء نے تو اس ترمیم کو قابل تعریف اقدام قرار دیا ہے۔ نوائے وقت ۱۸ اپریل ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں جناب عبدالنصیر غوری صاحب نے اس ترمیم کے خلاف کچھ اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ان کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ یعنی نمائندہ یا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اسے اپنے کچھ اختیارات تفویض کئے ہیں اور قرارداد مقاصد میں انہی الفاظ یعنی تفویض اختیارات کی وجہ سے پاکستان میں عدلیہ کو خود مختاری اور آزادی حاصل ہے بلکہ آخر میں تو یہاں تک فرما جاتے ہیں کہ ان عدالتوں کو

اختیارات براہ راست حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) سے حاصل ہیں اور اسی وجہ سے اسنام میں عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کی قطعی ضمانت ہے۔ لیکن مولانا کوثر نیازی صاحب کی ترمیم سے عدلیہ کی خود مختاری بری طرح متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہی ان کے مضمون کا عنوان ہے۔ چنانچہ فاضل مقالہ نگار نے اس بارے میں جو اعتراضات اٹھائے ہیں ہم ان کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

دینی اور غیر دینی علوم کے طرز تحقیق کے بارے میں ہم نے اپنے اہل علم کا عجیب و غریب طرز عمل دیکھا ہے۔ غیر دینی علوم میں ہمارے اہل قلم عقل و فکر کی ایسی جولانیاں دکھاتے ہیں کہ عقل محو حیرت ہو جاتی ہے چنانچہ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں جو عقلی دلائل دیئے ہیں۔ قارئین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن جب دینی علوم کا معاملہ آتا ہے تو یہی صاحبان اپنی عقل و فکر کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ اور محض سنی سنائی باتوں پر اپنے استدلال کی بنیادیں اٹھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً مضمون زیر تبصرہ میں فاضل مضمون نگار نے عربی لفظ ”خلیفہ“ کے صحیح معنوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ لیکن وہ اپنے مضمون کی بنیاد اس کے بالکل برعکس اس لفظ کے سنے سنائے اور غلط مفہوم پر اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ لفظ خلیفہ کے اس صحیح مفہوم پر کہ جو انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی زبانی نقل کیا ہے پر تھوڑا سا غور و فکر کر لیتے تو انہیں سرے سے یہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

### لفظ خلیفہ کا صحیح مفہوم

لفظ خلیفہ کا صحیح مفہوم سامنے لانے سے پہلے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں فاضل مضمون نگار کا استدلال اس کے اپنے الفاظ میں نقل کر دیا جائے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ گویا انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ زمین پر خدا کی نمائندگی

کرے۔ چنانچہ انسان اللہ تعالیٰ کے اختیارات اور اس کی بعض صفات کی نمائندگی کر سکتا ہے (صفحہ ۵ کالم ۲) یعنی وہ اسے وائسرائے کے معنی میں لیتے ہیں جو بوجہ غلط ہے۔ عربی زبان کی معتبر لغت تاج العروس میں الخلیفہ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ دوسرے کا جانشین نیز وہ فرمانروا جو اپنے سے پہلے فرمانروا کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خلفاء اور خلافت ہے۔ جانشین وہ ہوتا ہے جو کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اس کی جگہ لینے والا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کا لفظ (SUCCESSOR) اس کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ اب ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہستی کی جانشینی کا تصور ہی سرے سے باطل ہے۔ یہی وجہ تھی جیسا کہ فاضل مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے خلیفہ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے فوراً اس کی اصلاح کی کہ میں تو خلیفۃ الرسول ہوں نہ کہ اللہ کا خلیفہ۔ یعنی آپ رسول اللہ صلعم کے وصال کے بعد ان کے جانشین SUCCESSOR بنے اور جو خود ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہو۔ یعنی اللہ تبارک تعالیٰ تو اس کے جانشین بننے یا بنانے کا تو سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری اس وضاحت کی روشنی میں یہ تصور صرف باطل ہی نہیں بلکہ اگر کوئی اس پر اصرار کرے گا۔ تو وہ خود سوچ لے کہ اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے جو ایک پیش کش کی ہے یعنی انی جاعل فی الارض خلیفہ تو اس میں اگر خلیفہ سے اللہ کا جانشین مراد لینا اسلامی عقیدہ کے مطابق باطل ہے تو پھر اس کا صحیح مفہوم کیا ہی تو اس ضمن میں عرض ہے کہ اس آیت میں صرف لفظ ”خلیفہ“ ہے نہ کہ خلیفہ اللہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرت آدم کے لئے یہ لفظ آیا ہے لیکن اسے خلیفۃ اللہ نہیں کہا گیا بلکہ خلیفۃ فی الارض فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زمین میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین ہے نہ کہ نفوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ کا جانشین ہے۔ اور پھر سورہ الکہف کی چاسویں آیت میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ انسان سے پہلی



مخلوق کہ انسان جس کا جانشین بنا وہ جنوں کی مخلوق تھی۔

جب انسان کو اللہ کا جانشین یا نمائندہ کہنا ہی سرے سے شرک کی تعریف کے ذیل میں آتا ہو تو پھر ایسے مفروضہ جانشین کو اختیارات تفویض کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ میں نے کسی کو اپنے اختیارات تفویض کئے ہیں۔ اور نہ ہی حضورؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں اختیارات مجھے یا اپنے کسی بندے کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اور نہ ہی امت مسلمہ میں کسی خلیفہ، امام یا قاضی نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اختیارات ہی کو تو DIVINE AUTHORITY DHINE RIGHTS کہتے ہیں۔ جہاں مک راقم کے محدود مطالعے کا تعلق ہے امت مسلمہ میں کسی صحیح الذہن مسلمان تو کجا کسی جھوٹے بنی یا فاترالعقل شخص نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے کوئی خدائی اختیارات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اس نظریے کی بنیاد یہودیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور یہودیوں سے باہر غالباً صرف انگلستان کے بادشاہ جیمز دوم نے ان اختیارات کا دعویٰ کیا تھا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر زندگی گزارنے آیا ہے نہ کہ اس کا نمائندہ بن کر کسی نسل پر حکومت کرنے آیا ہے۔

## عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کا تصور

اب ہم بحث کے اس حصے کی طرف آتے ہیں کہ جس کے لئے فاضل مضمون نگار نے اپنے استدلال کی بنیاد خلیفہ کے غلط مفہوم پر اٹھائی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی ٹیڑھی ہوگی تو عمارت چاہے تریا تک پہنچ جائے اس میں کچی باقی رہے گی۔ اس بارے میں فاضل مضمون نگار مولانا کوثر نیازی صاحب پر یہ الزام لگانے کے بعد کہ اس ترمیم سے عدلیہ کی خود مختاری بری طرح متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ اپنے مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں کہ حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے تفویض

کردہ اختیارات کا اسلامی تصور عدلیہ کی آزادی کی کتنی بڑی ضمانت ہے۔ تاہم یہ ثابت ہے کہ حاکمیت اعلیٰ کی تفویض کا تصور، پاکستان میں اسلامی اقدار کے فروغ عدلیہ کی آزادی اور مقننہ انتظامیہ اور عدلیہ کی قطعی علیحدگی کی ضمانت ہے۔

فاضل مضمون نگار نے ایک غلط بنیاد پر اٹھائی ہوئی اپنی بحث کے نتیجے میں عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کی علیحدگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی کوئی مثال نہ تو پورے دور رسالت میں ملتی ہے اور نہ ہی خلفائے راشدین کے دور بابرکت میں کہ جسے اسلام کا مثالی دور سمجھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی عدلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر محض ایک سنی سنائی بات کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ قاضی ملازم رکھے تھے۔ عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کا اسلامی تصور پیش کیا ہے آئیے ہم آپ کو اسلامی عدلیہ کی تاریخ کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اس موضوع کی سب سے مستند کتاب ابن عروس کی تاریخ القضا فی الاسلام کھلی پڑی ہے اس کتاب کا دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ادارہ فروغ اردو لاہور کی جانب سے اس کا اردو ترجمہ بھی دس بارہ سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں خلافت راشدہ میں قاضی کے اختیارات اور دائرہ کار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم اس کے باب ”اختصاص القاضی فی ہذا العصر“ سے نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

”اسلام کے ابتدائی دور میں ایک ہی شخص والی اور قاضی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ حضرت فاروق اعظم نے علیحدہ قاضی بھی مقرر کئے تاہم ان قاضیوں کا کام مختصر نوعیت کا تھا اور یہ قاضی صرف شہری جھگڑوں کو پنپاتے تھے اور اس بارے میں زیادہ تر اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر کرنے کی بجائے وہ احتیاطاً خلیفہ کا حکم دریافت کر لیتے تھے۔ اسی کتاب کے ایک اگلے باب ”مرجع القاضی فی احکامہ“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔!

”قاضی اہم مسائل خلیفہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے ان کی طرف ارسال

لرتے تھے حضرت بن عبدالعزیز کے قاضی عیاض بن عبداللہ نے حق شفعہ کے متعلق نئی حکم دریافت کیا اس سے پہلے 'قریبی پڑوسی' پھر اس کے قریب پڑوسی کے حق میں فیصلہ دیا جاتا تھا تو آپ نے جواباً لکھا کہ اب یہ حق صرف شریک ہی کو دیا جائے اور ساتھ ہی لکھا کہ جب میراث میں مختلف شرکاء کے واضح حصے مقرر کر دیئے گئے اور لوگوں کے اپنے گھروں اور زمینوں میں جانے کے لئے علیحدہ علیحدہ راستے ہوں تو پھر حق شفعہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے مسئلے میں ایک ایسی عورت کی ویت کے متعلق وضاحت چاہی جو کسی راہ رو کے گھوڑے کی وجہ سے جان بحق ہو گئی ہو اور اس شخص کے رشتہ دار ویت دینے سے انکاری ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھ کر بھیجا کہ ویت اس کے رشتہ داروں پر ہوگی۔ اس کے علاوہ بھی قاضی نے بہت سے مسائل دریافت کئے۔"

ان اقتباسات سے جو اسلام کے مثالی دور کے بارے میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اس دور میں عدلیہ اور انتظامیہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی شخص دونوں فرائض انجام دیتا تھا۔ اور مزید یہ کہ قانون کی تعبیر یا معروف و منکر کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف خلیفہ وقت کو حاصل تھا۔ نہ کہ کسی عدالت کو۔

تاہم ہمارے اس استدلال کا مطلب عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے تصور کے خلاف دلائل مہیا کرنا نہیں۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جو حضرات اسے خلافت راشدہ کے دور سے ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ ان کی اسلامی عدلیہ تاریخ سے بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔ موجودہ دور کے ماہرین قانون انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے تصور کو انسانیت کے لئے نعمت غیر مرقہ سمجھتے ہیں۔ اور آج اخلاقی معیار بھی وہ باقی نہیں رہا۔ جو خلافت راشدہ کے دور بابرکت میں تھا۔ تو اس صورت حالات میں اسلامی تعلیمات میں عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کی گنجائش ملتی ہے۔ اور میرے خیال میں حکومت بھی اس کے حصول کے لئے آئین سے بھی پہلے قانون اصلاحات کے ذریعے اس طرف قدم اٹھا چکی ہے۔

## مسلمانوں کے خلیفہ سے کسی جرم کا سرزد ہونا

اب ہم ایک نئے مسئلے کی طرف آتے ہیں کہ جس کی وضاحت سے فاضل مضمون نگار کی غلط بنیاد پر اٹھائی ہوئی ساری عمارت دھڑام سے نیچے گر پڑے گی۔ یہ اہم مسئلہ ہے مسلمانوں کے خلیفہ سے اگر جرم سرزد ہو جائے تو اسے کس طرح اور کون سزا دے گا۔ جیسا کہ ہم تاریخ القضا فی الاسلام سے نقل کر آئے ہیں۔ کہ قصاص اور حدود کے تمام مقدمات کے فیصلے خود خلفاء کرتے تھے۔ اسی طرح جب ماتحت گورنروں سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تو اس کی سزا بھی خلیفہ بنفس نفیس دیتا تھا۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور فیصلے کی عام طور پر مثال دی جاتی ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خود خلیفہ سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اسے کون سزا دے گا۔ یا اس پر حد جاری کرے گا ہمارے فاضل مضمون نگار نے تو اسلامی تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر فرمائی ہے۔ اس کے مطابق اسلامی ملک کی عدالتیں براہ راست حاکم اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ سے اختیارات حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے وہی خلیفہ کو سزا دینے اور اس پر حد جاری کرنے کی مجاز ہوں گی۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نکتہ جو فاضل مضمون نگار نے پیدا کیا ہے۔ نہ خلفائے راشدین کے ذہن میں اور نہ ہی امت کے ہزاروں ائمہ فقہ یعنی ماہرین قانون اسلامی کی سمجھ میں آسکا معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا مسئلہ خلفائے راشدین کے زمانے تک تو خلاف نظر ہی رہا۔ لیکن بعد کے خلفاء سے جرم سرزد ہوئے تو اس اہم مسئلے کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے ائمہ فقہ یا اسلامی قانون کے ماہرین اکٹھے ہوئے۔ اس بارے میں انہوں نے جو فیصلہ دیا وہ ان ہی کے الفاظ میں ہم حنفی فقہ کی معتبر کتاب ہدایہ اولین مطبوعہ مطبع مجیدی کے صفحہ ۴۹۳ سبب الوطی الذی یوجب الحد والذی یوجہہ سے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

کل شی صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلا حد علیہ

## الاقصاص-

ترجمہ: ایسا اسلامی حکمران جس کے اوپر کوئی دو سرا بڑا نام نہیں تو وہ جو بھی جرم کرے اس پر کوئی حد نہیں سوائے ان جرائم کے کہ جن میں قصاص ہے۔ ائم فقہ کے اس اہم فیصلے کی بنیاد یہ تھی کہ اسلامی ریاست میں خلیفہ سب سے آخری اتھارٹی ہے۔ جس کے اوپر کوئی دوسری اتھارٹی نہیں۔ اس لئے اس پر شرعی حد نافذ کرنی سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ہاں جن جرائم میں قصاص لازم آتا ہے۔ وہ اسے خود ادا کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ اسلامی قانون میں جرائم کی مختلف نوعیتوں سے لگایا جاسکتا ہے مثلاً چوری کرنے، شراب پینی، زنا کاری، کھٹا پر شرعی حد جاری ہوگی۔ ان جرائم میں قصاص یعنی کسی بدل سے تلافی کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جبکہ بعض جرائم ایسے ہیں کہ جہاں حد نافذ نہیں کی جاتی بلکہ بدلہ یعنی قصاص دلا دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کی انگلی یا ہاتھ کانٹے کا جرم سرزد ہوا ہے۔ تو ایسے مجرم پر حد جاری نہ ہوگی۔ بلکہ کسی بدل سے اس جرم کی تلافی کی جائے گی۔

### قرار داد مقاصد میں عدلیہ کی علیحدگی ضمانت دی گئی ہے۔

یہ تو ہے فاضل مضمون نگار کے اس استدلال کی حقیقت جو انہوں نے اسلامی تعلیمات سے کیا تھا۔ اب ہم ان کے اس خدشے کو کہ قرار داد مقاصد میں ترمیم سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوگی، خود قرار داد مقاصد کے الفاظ کو لیتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار تو پہلے پیرے سے صرف ایک لفظ کے حذف سے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں۔ کہ اس سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوگی۔ حالانکہ اسی قرار داد مقاصد میں عدلیہ کی آزاد کے بارے میں ایک علیحدہ مختصر سا پیرا ہے کہ جس میں بڑے واضح الفاظ میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جس کی موجودگی میں مولانا کوثر نیازی صاحب کی ترمیم سے کسی اثر کے پڑنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

## اسلامی سوشلزم کا ہوا

فاضل مضمون نگار نے مولانا کوثر نیازی کی ترمیم سے بارے میں وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کی اس وضاحت کا ذکر بھی کیا ہے کہ جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ ترمیم محض عقیدہ کی اصلاح سے متعلق ہے۔ یہ کسی قانونی دفعہ کو متاثر نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود جو انہوں نے اتنی محنت سے یہ مضمون تیار کیا ہے۔ تو اس کے بارے میں بھی ایک موقع پر اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ خود انہی کی زبانی اسے سنایا جائے۔ فرماتے ہیں۔

”مولانا کوثر نیازی ایک ممتاز عالم ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ قرارداد مقاصد اور آئین بل کے دیباچہ کے الفاظ کی توجیہ کے پس پردہ ان کے دینی علم کی بجائے پیپلز پارٹی کے سوشلسٹ نظریات کار فرما ہیں۔ موجودہ بحث سے ثابت ہو جائے گا کہ آئین میں قرارداد مقاصد کے ان الفاظ کو شامل کر لینے سے جنہیں ترمیم کیا گیا ہے۔ برسر اقتدار جماعت سوشلسٹ نظام رائج کرنے کی کوشش میں اسلام کو بلائے طاق نہیں رکھ سکتی۔“

ان کی بحث سے جو کچھ ثابت ہوتا تھا وہ تو اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اس طرح بلا واسطہ طور پر انہوں نے جن خدشات کا ذکر کیا تھا وہ بھی بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل ہمارے ایک خاص طرز فکر کے اہل علم اسلامی سوشلزم کی اصطلاح سے اس حد تک الرجک ہو چکے ہیں۔ کہ اگر حکومت کوئی بھی اچھا کام کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ کرے ان حضرات کو اس سے سوشلزم کی بو آنے لگتی ہے۔ مثلاً مسئلہ زیر بحث سے انہیں جو سوشلزم کی بو آئی ہے اس کے بارے میں راقم ایک ذاتی وضاحت پیش کرتا ہے کہ جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس ترمیم سے برسر اقتدار جماعت کا سوشلسٹ نظام رائج کرنے سے دور کا بھی تعلق نہیں اور جس کی وضاحت محترم وزیر قانون فرما چکے ہیں۔ دراصل راقم بھی ان لوگوں میں سے ہے۔ جنہوں نے

موانعاً نہ ثریازی صاحب کو قرار داد مقاصد کی اس غلطی کی طرف متوجہ کیا۔ اور پھر  
 عالمی طور پر انہیں قائل کیا۔ میں ان کی جرأت کی داد دیتا ہوں کہ جب انہوں نے  
 ایک چیز کو حق سمجھ لیا تو اس کی اصلاح کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کی۔ یہی وجہ  
 ہے کہ علماء نے ان کی اس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔



## عدالتی مقدمات کی تعداد کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے!

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پنجاب کی ۵۶۹ عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات کی تعداد بڑھتے بڑھتے چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ حکومت پنجاب کے ایک حامی اخبار نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ہمارے ججوں کے پاس روزمرہ کا کام نمٹانے کے لیے ضروری سہولتیں نہیں ہیں ان کے پاس گھر سے دفتر آنے کے لیے گاڑیاں نہیں ہیں ان کے پاس سٹیٹوگرافر نہیں ہیں اور اگلے گریڈوں میں ان کی ترقی کے مواقع بہت کم ہیں ان کو اپنے ہاتھوں سے فیصلے لکھنے پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور یکم جون ۱۹۸۹ء)

معلوم نہیں ہمارے ملک کے بڑے بڑے صحافی مسائل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اور جو کچھ انہیں بتایا جاتا ہے۔ اسے وہ اپنی رائے کے طور پر پیش کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اس معاملے پر تھوڑا سا غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اس مسئلہ کا حل موجود ہے جس پر بوجہ عمل نہیں کیا جاتا اور جو حل وہ پیش کر رہے ہیں اس پر پولیس کے سلسلے میں عمل ہو چکا ہے لیکن اس کے کوئی خوشگوار نتائج نہیں نکلے، پولیس کی ناقص کارکردگی کے بارے میں بھی یہی رونا رویا جاتا تھا۔ اس کے پاس تیز رفتار گاڑیاں نہیں۔ انہیں یہ گاڑیاں مہیا کر دی گئی تو ان کی



کارکردگی کا جو حال ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔  
اس بارے میں اگر اپنے ملک کے ایک سابقہ صوبے یعنی مشرقی پاکستان کا حوالہ  
دیا جاتا تو اس کے حوالے سے ایسا طریقہ اختیار کیا جاسکتا تھا کہ جس کے نتیجے میں  
ہمارے ملک میں جرائم کی تعداد ہی کم ہونی شروع ہو جاتی جیسا کہ وہاں عملاً ہو چکی  
ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مقدمات کو زیادہ تر تعداد کا تعلق تین جرائم یعنی  
زمین 'زن اور زر سے ہے اور یہ جرائم غیر حاضر زمینداری نظام کا خاصا ہیں سابقہ  
مشرقی پاکستان اور حال بنگلہ دیش میں غیر حاضر زمینداری کا خاتمہ ہو چکا ہے اس لیے  
وہاں ان جرائم کی تعداد کم ہو چکی ہے اس لیے مقدمات میں اضافہ ہونے کی بجائے  
کمی ہوتی گئی حیرت کی بات ہے کہ بنگلہ دیش میں یہ انقلابی قدم اسلامی تعلیمات کی  
روشنی میں اٹھایا جا چکا ہے اور پنجاب کی حکومت صوبے میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا  
اعلان کر چکی ہے اس لیے اس کے لیے اس اہم مسئلہ کے بارے میں اسلامی  
تعلیمات پر عمل کرنا مشکل نہیں۔

بنگلہ دیش میں جب بنگال کا بندوبست دوامی مجریہ ۱۹۷۳ء کو منسوخ کر کے غیر  
حاضر زمینداری نظام ختم کیا گیا تو اس کی گونج پاکستان میں بھی سنی گئی۔ ان دنوں  
پاکستان قومی اتحاد کی جانب سے حکومت کے خلاف تحریک شروع کی جا چکی تھی۔ اس  
نے ۱۹۷۷ء کے قومی انتخابات کے لیے جو منشور شائع کیا اس میں بنگلہ دیش کے اس  
انقلابی قدم کی جھلک موجود تھی۔ اس منشور کے صفحہ ۱۶ پر قومی اتحاد کے لیڈروں کی  
جانب سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ غیر حاضر زمینداری 'خلاف اسلام ہے۔ قومی اتحاد  
برسر اقتدار آکر اسے ختم کر دے گا۔ خیال رہے کہ قومی اتحاد کے اس منشور پر جناب  
مفتی محمود، ابو الاعلیٰ مودودی مولانا شاہ احمد نورانی سمیت تمام دینی جماعتوں کے  
سربراہوں کے دستخط تھے۔ یہ منشور ملک کے تمام اخبارات میں شائع ہوا تھا اور  
منشور کے مذکورہ بالا اعلان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی اتحاد

نے ”ہل“ کو اپنے انتخابی نشان کے طور پر منتخب کیا تھا۔ قومی اتحاد کے لیڈر جہاں بھی جاتے، غریب کسانوں کو یقین دلاتے کہ اب زمین اسی کی ہوگی جو اس میں ہل چلائے گا۔

قومی اتحاد میں شامل کچھ سیاسی پارٹیاں، انتخابات کے ذریعے تو نہیں البتہ سازش کے ذریعے برسر اقتدار آگئی تھیں۔ لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد یہ اسلام کے نعرے لگانے والی پارٹیاں قوم اور غریب کسانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو بھول گئیں اور ملک سے غیر حاضر زمینداری ختم کرنے کی بجائے اس کی جڑیں مزید مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

ان میں سے بعض جماعتیں اب اسلامی جمہوری اتحاد کے جھنڈے کے تحت پنجاب میں برسر اقتدار ہیں۔ اگر وہ اپنے قومی اتحاد والے منشور پر عمل نہ کر سکیں تو اب تو اس جمہوری دور میں عمل کر سکتی ہیں۔ خاص طور پر پنجاب اسمبلی یہ قرارداد بھی پاس کر چکی ہے کہ زراعت اور غیر حاضر زمینداری صوبائی معاملہ ہے۔ اس میں وفاقی حکومت کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ وفاقی حکومت نے تو دخل نہیں دیا۔ لیکن اب وہ اسلامی تعلیمات پر تو عمل کر سکتے ہیں۔ جن کا اعلان انہوں نے قومی اتحاد کے منشور میں کیا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ہماری عدالتوں میں مقدمات کی تعداد بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔ بلکہ معاشرہ پر اس کے کئی دوسرے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں مقدمات کا تعلق تین قسم کے جرائم سے ہے۔ یعنی زمین، زن اور زر اور بد قسمتی سے ان میں سے اکثر جرائم کے پیچھے ان غیر حاضر زمینداروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر شازو نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ کسی غریب مزارع کو قربانی کا بکرا بنایا جائے اس کی وضاحت مارشل لاء دور کے مشہور شبہ نام کیس سے ہوتی ہے۔ ایک فوجی عدالت سے بڑے بڑے زمیندار گھرانوں کے چشم و چراغوں کو عورت کی بے حرمتی کا مجرم قرار دیا۔

اس زمانے میں غریب لوگوں کو تابڑ توڑ کوڑے مارے جا رہے تھے لیکن ان زمیندار گھرانوں کے شہزادوں کو ایسی سزا سے بچالیا گیا۔ ان کو جو قید کی سزا سنائی گئی تھی اس قید کے گزرنے کے بارے میں بھی کئی ناگفتنی باتیں کی جاتی رہیں۔

اگر زمین کو اسلامی تعلیمات کے مطابق صرف اسے اس کاشتکار کی ملکیت قرار دیا جائے جیسا کہ بنگلہ دیش میں ہوا ہے تو زمین سے متعلق تمام مقدمات کا فوری طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔ اخبارات کے صفحات گواہ ہیں کہ ہمارے ملک میں عورتوں کے خلاف جو جرائم کئے جاتے ہیں ان کے پیچھے بھی انہی بڑے زمینداروں کے ہاتھ ہوتے ہیں اور اگر یہ پکڑے بھی جائیں جیسا کہ ملتان کے قریب نواب پور میں غریب عورتوں کو انہوں نے بازار میں ننگا چکر لگوایا تھا اور پکڑے گئے تھے تو پھر بھی ان کا بال بیکا نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پیچھے مفت کی آمدنی ہوتی ہے جسے خرچ کر کے خود تونچ جاتے ہیں اور عام طور پر بے قصور لوگوں کو پھنسا دیتے ہیں۔ زر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے حوالے سے جو جرائم ہوتے ہیں ان کے پیچھے ان بڑے زمینداروں کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوریاں، ڈاکے اکثر بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ ان زمینداروں کا تعلق نہیں تھا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان جرائم کے ساتھ بھی ان کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے مثلاً لاہور میں پکڑے جانے والے کئی عادی چوروں نے یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنے گاؤں سے زمینداروں کے مظالم سے تنگ آکر شہروں میں محنت مزدوری کرنے کے لئے آئی تو پھر بھی زمینداروں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور انہیں مختلف قسم کے مقدمات میں ملوث کروا دیا۔ ان مقدمات کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ عادی مجرم بن گئے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں گزارش ہے کہ عدالتوں میں مقدمات کی تعداد کم کرنے کے لئے ججوں کو گاڑیاں اور دوسری سہولتیں مہیا کرنے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ان عوائل کو ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ جن کے نتیجے میں اکثر جرائم سرزد ہوتے ہیں اور ان کی سب سے بڑی وجہ ملک میں انگریز کا نافذ کردہ غیر حاضر

زمینداری کا غیر اسلامی نظام ہے۔ اسے ختم کرنے سے مقدمات کی تعداد میں معتدبہ کمی ہو سکتی ہے اور اس کی عملی مثال بنگلہ دیش میں ایسا ہی قدم اٹھا کر پیش کی جا چکی ہے۔ (جون ۱۹۸۹)



## اجتہاد اور عدلیہ کی ذمہ داری

اجتہاد کے لفظی معنی کوشش کرنے ہیں اور شریعت اسلامی میں اس سے مراد ایسا طریق کار ہے کہ اگر کسی معاملے کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح حکم نہ ملے تو اسے قرآن حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں حل کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی ضرورت اس وقت پیش آسکتی ہے کہ جب ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو اور تمام معاملات کے فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہو رہے ہوں۔ اس سلسلے میں مسلمان فقہاء کے فتاویٰ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے کہ جنہوں نے اختلاف کے باوجود ہر زمانے میں نئے نئے پیش آنے والے معاملات کے بارے میں اپنے فیصلے صادر کئے۔ ان میں سے جس عالم دین کے فیصلے کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق پایا جائے اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی اجتہاد ہی کی ایک قسم ہوگی۔

ہمارے ملک میں اسلامی علوم میں مہارت حاصل کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے بہت سے ایسے حضرات جو اپنے اپنے کو علامہ کہلانے پر مصر ہیں، ان کا علم سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ ایسی ایسی تحقیقات پیش کرتے ہیں کہ جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوتی ہیں، اس کی جھلک آئندہ سطور میں قارئین کے سامنے خود بخود آجائے گی۔ ان میں سے جو حضرات اپنے آپ کو

روشن خیال قرار دیتے ہیں ان کی حالت ان سے بھی بری ہے وہ ایسے مسائل کو اجتہاد کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود ہیں۔ لیکن چونکہ انہیں ان احکامات کا علم نہیں ہوتا تو وہ اپنی روشن خیالی کا بھرم رکھنے کے لئے اجتہاد کی روشنی میں ایسے مسائل کا دل پیش کرتے ہیں۔ جس سے وہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج اسے ایٹم بم کے بعد دنیا کا دوسرا اہم ترین مسئلہ قرار دیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں جب اس اسکیم کا نفاذ ہوا تو علماء حضرات کہ جنہیں اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکامات کا علم نہیں تھا اسے خلاف اسلام قرار دے کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ روشن خیال علماء نے بھی یہ کوشش نہ کی کہ تھوڑی سی محنت کر کے اس بارے میں قرآن و حدیث کا حکم ہی معلوم کر لیں۔ انہوں نے علماء حضرات کی مخالفت سے یہ غلط اندازہ لگایا کہ واقعی یہ اسکیم اسلام کے خلاف ہے اور انہوں نے اجتہاد کے زور پر اسے جائز قرار دینے کی کوشش کی علماء حضرات نے ان کے اجتہاد کو ماننے سے انکار کر دیا اور پہلے سے بھی زیادہ اس مفید اسکیم کی مخالفت شروع کر دی۔

ہمارے ہاں جو یہ کہا جاتا ہے کہ علماء حضرات نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ تو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہر زمانے میں مسلمانوں کو جب ایسے نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا کہ جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود نہیں تھے۔ تو انہوں نے اجتہاد کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا یہ ایسے لوگ تھے کہ جنہیں اسلامی علوم پر کافی مہارت تھی اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ مختلف ممالک کے علماء نے ان مسائل کے بارے میں ایک ہی جیسے فتوے دیئے حالانکہ ان زمانوں میں نہ تو ڈاک و تار کا نظام تھا اور نہ ہی ان کے درمیان آج کی طرح رابطے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے متوے ایک جیسے ہوتے تھے۔

اس کی مثال تمباکو نوشی کا مسئلہ ہے اسلامی ممالک میں اس کا رواج پچھلی صدی میں اس وقت ہوا جب یورپی طاقتوں نے بہت سے اسلامی ممالک کو اپنے زیر نگیں کر لیا تھا قدیم زمانے کے اکثر جید علماء حکمت اور طب کے پیشے سے اپنی روزی کھاتے تھے وہ آج کل کے علماء کی طرح دینی خدمات کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے بلکہ اپنی گزر بسر طب کے پیشے سے کرتے تھے۔ انہوں نے تمباکو نوشی کے اثرات کا انسانی صحت ہر جائزہ لیا تو اسے نقصان دہ پایا۔ اسے اس عادت کا کوئی نفع بخش پہلو نہ ملا۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس عادت کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اپنی دولت کو ضائع کیا جاتا ہے بلکہ اس کے ذریعے لوگوں کی صحت پر بھی اس کے مضر اثرات پڑتے ہیں تو انہوں نے اجتہاد استعمال کرتے ہوئے تمباکو نوشی کو حرام قرار دے دیا۔ اس زمانے میں نہ تو ڈاک و تار کا نظام تھا اور نہ ہی مختلف اسلامی ملکوں کے علماء کے درمیان کوئی رابطے تھے لیکن حیرت ہے کہ ان سب نے ایک جیسے فتوے دیے۔ یعنی تمباکو نوشی کے حرام ہونے کے بارے میں جیسا فتویٰ مصر میں جاری ہوا ویسا ہی ایران کے علماء نے دیا۔ ہندوستان کے علماء کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق تھا۔ اصل میں اس مطابقت کی بنیاد یہ تھی کہ ان تمام ممالک کے یہ علماء جید عالم دین تھے۔

اس وقت علما کوئی ایسا مسئلہ موجود نہیں کہ جس کے حل کرنے کیلئے اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہو۔ ہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے بعد جب تمام عدالتی فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہونے لگیں گے۔ تو اس وقت کوئی ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ کسی نئے پیش آنے والے معاملے کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح حکم نہ ملے۔ تو اس صورت میں حج صاحبان کو اجازت ہوگی کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ متعلقہ حج صاحبان کو اسلامی علوم پر مکمل دسترس ہو۔

اسلامی نظام کے نفاذ کا قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ان اسلامی احکامات کو نافذ کیا جائے کہ جن کے بارے میں امت مسلمہ کا کابل اتفاق ہے۔ اس

طرح: سب ابتداء ہو جائے گی تو آہستہ آہستہ اختلافی مسائل کے حل کو راہ بھی پیدا ہو جائے گی۔ اور انجام کار مختلف فرقوں میں اختلافات بھی کم ہوتے جائینگے۔ اتفاق سے اسلام کا مالیاتی نظام ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر اسلامی ریاست کی عمارت استوار کی جاتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء حضرات نے نہ تو کبھی اس نظام کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور نہ ہی اس کی تفصیلات پیش کی ہیں بلکہ اس حوالے سے ان کو جو تحریریں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اس نظام کی شد بد بھی نہیں ہے۔

اسلام کے مالیاتی نظام کے مطابق ہمارے ملک کی تمام اراضی خراجی کے ذیل میں آتی ہے جو اصولاً تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت سمجھتی جاتی ہیں اور حکومت نے ان کی طرف سے اس اراضی کا انتظام کرتی ہے۔ اس اراضی کو نہ تو بیچا جاسکتا ہے اور نہ ہی خریدا جاسکتا ہے، اس سے صرف فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کی آمدنی کا ایک حصہ بطور خراج، اسلامی ریاست کے بیت المال میں جمع کرانا ہوتا ہے۔ یہ اسلامی حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد ہوتی تھی اور اس سے حکومت کے اکثر اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔ برصغیر ہندو پاکستان پر مسلمانوں نے کوئی ایک ہزار سال تک حکومت کی اور اس تمام دور میں اسلام کے اس مالیاتی نظام پر عمل ہوتا رہا۔ اگرچہ یہاں کے مسلمان حکمرانوں میں بڑی بڑی خرابیاں تھیں لیکن اس نظام کے طفیل ان کا ملک، اس وقت کے تمام ممالک میں خوشحال ملک شمار کیا جاتا تھا۔

جب انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس اسلامی نظام کو بدل کر اپنا مالیاتی نظام رائج کیا اور اسلامی دور حکومت میں جو لوگ زمین کا انتظام اور بندوبست کرنے پر مقرر تھے انہیں اس کا مالک بنا دیا اور اس طرح ملک میں غیر حاضر زمینداری کا نظام وجود میں آگیا۔ جس کی اسلام میں گنجائش نہیں حیرت کی بات ہے کہ موہودی صاحب جسے عالم دین نے اسے اسلامی ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب لکھی جس میں فیوڈلززم کو ایک اسلامی ادارہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔



لیکن زمانے کے تقاضے بھی عجیب ہیں۔ اب جماعت اسلامی کے موجودہ امید قاضی حسین احمد صاحب فیوڈلزم کو، اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ قرار دے رہے ہیں۔

اسلامی نظام عدل کے نفاذ کے لئے۔ اسلامی علوم ہر کابل دسترس از حد ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں ہمارے علماء نے جو یہ اختیار کر رکھا ہے اس کی جھلک سابقہ سطور میں پیش کی جا چکی ہے۔ ان حضرات کا دوسرے اہم معاملات کے بارے میں یہی حال ہے۔ مثلاً مصر اور کچھ دوسرے عرب ممالک میں ۱۹۲۹ء میں مسلم عائلی قوانین کو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدون کیا گیا۔ اس میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا کہ مختلف فقہی مذاہب کے جو فتاویٰ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تھے، انہیں اختیار کر لیا گیا تھا۔ اسے اجتہاد ہی کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر کے علماء نے مصری علماء کی اس کوشش کی بے حد تعریف کی۔ مودودی صاحب نے تو ان قوانین کو اردو کا جامعہ پہنا کر حقوق الزوجین نامی کتاب کی صورت میں پیش کر دیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب ۱۹۶۱ء میں یہی قانون اپنے ملک میں نافذ ہوئے تو انہوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان قوانین کو اس بنیاد پر مخالفت نہیں کی گئی تھی کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ بلکہ یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہیں۔ بلاشبہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اکثریت حنفی فقہ کی پیروکار ہے۔ لیکن اگر موجودہ دور کے قانون دان جنہیں اسلامی علوم پر کابل دسترس حاصل ہو اور وہ کسی دوسرے مذہب کے فتویٰ کو، موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق سمجھیں تو اس کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں اور مسلمان ہر دور میں اسے اختیار کرتے رہے ہیں۔ مثلاً شریعت اسلامی میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ لیکن ظالم بادشاہ اصل چوروں کو تو یہ سزا نہیں دیتے تھے لیکن اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنے مخالفوں پر چوری کا الزام لگا کر ان کے ہاتھ کٹوا دیتے تھے۔

شافعی مذہب کے بانی امام محمد ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ظلم کو محسوس کیا اور انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ چور کو چوری کے بعد 'جیل میں ڈال دیا جائے اور اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور یہ کہ وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو اسے رہا کر دیا جائے۔ ہاتھ کاٹنے کی سزا تو صرف اس عادی چور کو دی جائے کہ جو اپنے جرم سے توبہ کرنے پر راضی نہ ہو۔ بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں نے جن میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر بھی شامل تھے امام شافعی کا یہ فتویٰ اختیار کر لیا تھا۔ حالانکہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر حنفی فقہ کا کٹر پیروکار تھا اور اسے ملک میں نافذ کرنے کیلئے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرایا تھا۔

ترکی کے حکمران بھی حنفی فقہ ہی کے پیروکار تھے۔ لیکن جب زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق انہوں نے اسلام کے عدالتی نظام کو مدون کرنے کے لئے مجلہ الاحکام العدلیتہ مدون کیا تو اس میں بعض ایسے فقہی مذاہب کے فتاویٰ بھی اختیار کر لئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مردہ ہو چکے تھے۔ خیال رہے کہ جب شروع شروع میں اسلامی قانون کی تدوین کی گئی تو کوئی ستر کے قریب ایسے مذاہب وجود میں آگئے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی مذاہب ختم ہو گئے اور ان میں سے صرف آٹھ مذاہب کے پیروکار باقی رہ گئے۔

مصر میں ان آٹھوں مذاہب کے پیروکار موجود ہیں۔ چنانچہ وہاں عدلیہ کی سہولت کے لئے اسلامی قانون کو اس صورت میں مدون کیا گیا کہ ہر مسئلہ کے بارے میں ان آٹھوں فقہی مذاہب کا مسلک پیش کر دیا گیا۔ یہ مجموعہ چونکہ کرنل جمال عبدالناصر صدر مصر نے مرتب کر لیا تھا اس لئے اس ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ ہمارے ملک کی عدلیہ بھی اس مجموعہ سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حکومت نے اسلامی نظام میں پیش رفت کیلئے جو ادارے قائم کر رکھے ہیں اور جن کے کارناموں سے ابھی تک قوم ناواقف ہے ان کے ذمے یہ کام لگا دیا جائے کہ وہ اس مجموعہ کا اردو ترجمہ کر کے ملکی عدالتوں کی مدد کریں تاکہ وہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ

کر سکیں۔

ان تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ لیکن بہت کم ایسے مسائل ہونگے کہ جن کیلئے اجتہاد کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے مختلف فقہی مذاہب کے فتوے، موجودہ زمانوں کے تقاضوں کے مطابق ہو سکتے ہیں انہیں عدالتی فیصلوں کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے ہاں اگر کسی مسئلہ کے بارے میں کسی بھی فقہی مذہب سے رہنمائی حاصل نہ ہو سکے تو پھر قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والے حضرات کو اسلامی علوم، پر کمال دسترس حاصل ہو۔



## علامہ اقبال اور اسلامی قانون کی تشکیل جدید

علامہ اقبال برصغیر کے پہلے اہل علم تھے جنہوں نے اسلامی قانون کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے یے مدون کرنے کا خیال پیش کیا۔ اگرچہ علامہ صاحب بنیادی طور پر ایک عظیم شاعر تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرے میں بھی زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے علماء پر زور دیا کہ وہ قدامت پسندی ترک کر کے زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانون کی نئے سرے سے تشکیل کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں ان اصولوں کی نشاندہی کی کہ جن کی روشنی میں یہ کام سرانجام دیا جاسکتا ہے اسی مقصد کے لئے انہوں نے اجتہاد کے دروازے کو دوبارہ کھولنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لیے ایک طریقہ کار بھی تجویز کیا۔

علامہ اقبال نے یہ طریقہ کار آج سے کوئی ساٹھ سال پہلے پیش کیا تھا اور تمام روشن خیال علماء نے اسے پسند کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارے معاشرے میں بڑی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں جن کا تقاضا ہے کہ اس پر علامہ نے جو نقطہ نظر پیش کیا تھا اس کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے لیکن بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایسا کرنے کو علامہ اقبال کی بے ادبی تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال اگر زندہ

ہوتے تو ان خیالات پر تنقید کو خوش آمدید کہتے کیونکہ انہوں نے اپنے خطبات کے دیباچے میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ہر دور میں خیالات ترقی پذیر ہوتے رہتے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد دوسرے پیش کردہ نظریات سے بھی زیادہ اچھے تصورات پیش کئے جائیں (خطبات انگریزی ص: ۷۱) چنانچہ علامہ صاحب کی اس وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی قانون کی تشکیل جدید کے بارے میں ان کے خیالات کا مختصر سا جائزہ لیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی ترقی میں ہمارے عظیم فقہاء نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۸) لیکن بعد کے علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اسلامی قانون کو جامد بنا دیا جس سے مسلمان معاشرہ تنزل کا شکار ہو گیا۔ (ایضاً صفحہ: ۱۴۸) حالانکہ اس جمود کی وجوہات کچھ دوسری تھیں۔ جن کی طرف علامہ اقبال نے توجہ نہیں فرمائی۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ اس زمانے میں روشن خیال علماء اجتہاد سے کام لے کر اسلامی فقہ کی ثروت میں اضافہ کرتے رہے ہیں لیکن بد قسمتی سے اس دور میں ملوکیت نے اسلامی حکومت کی جگہ لے لی تھی اور اس نے عوام میں اپنی جڑوں کو مضبوط بنانے کے لیے اجتہاد کے حوالے سے کچھ بدعات کو مروج کیا۔ حق پرست علماء نے اس عمل کی سخت مخالفت کی اور انہوں نے اجتہاد پر عمل کرنے کے لیے سخت قیود عائد کیں جس کے نتیجے میں ہر ایرے غیرے کے لیے اس اسلامی اصول کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اب اس زمانے جدید میں حالات بالکل بدل چکے ہیں اور دوسری صدی ہجری میں مرتب کردہ فقہ کے بعض قانون اس زمانے کے لیے قابل عمل نہیں رہے۔ ان قوانین کو زمانہ حال کی روشنی میں نئے سرے سے تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں انہوں نے ترکی کے تجربے کا ذکر کیا۔ جس کے ان کے خیال کے مطابق خوشگوار نتائج نکلے۔ لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت

کر دیا کہ اس بارے میں علامہ صاحب کا نقطہ نظر صحیح نہیں تھا۔

علامہ کو اجتہاد کی اہمیت دلانے کے لئے علامہ صاحب ترکی کے تجربے کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح اس اصول کی روشنی میں ترک قوم نے اپنے سیاسی اور مذہبی افکار میں پیش رفت کی۔ اس سلسلے میں علامہ صاحب ترکی قوم کے اہل علم کے دو متضاد نظریے پیش کرتے ہیں ایک نظریہ جناب حلیم ثابت کا تھا جس نے اسلامی قانون کی تدوین جدید پر زور دیا۔ اس بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ فقہ کے تمام مکاتب کو سامنے رکھ کر ایک ایسی فقہ مرتب کی جائے جو زمانہ جدید کے تقاضوں کے بھی مطابق ہو اور مختلف فرقوں کو بھی مطمئن کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے ایک کمیٹی قائم کی اور اسے اجازت دی گئی کہ وہ اس مقصد کے لئے مردہ فقہی مذاہب کی آراء بھی اختیار کر سکتی ہیں۔

چنانچہ اس کمیٹی نے مجلہ الاحکام العدلیتہ کی شکل میں اسلامی قانون کی تدوین جدید کی۔ اس مجلہ میں امام ابن شبرمتہ کے بہت سے اقوال بھی اختیار کر لیے گئے حالانکہ ان کا فقہی مذہب اب مردہ ہو چکا تھا اور دنیا کے کسی علاقے میں اس کے پیروکار نہیں تھے لیکن چونکہ ان کی آراء زمانہ جدید کے تقاضوں کے عین مطابق تھیں اس لیے مجلہ میں انہیں اپنایا گیا۔ ہمارے ہاں اسلامی قانون کی تشکیل جدید کے لیے یہ راست سمت کی طرف ایک اہم قدم تھا لیکن علامہ صاحب نے اس کی بجائے ترکی شاعر ضیاء گو کلب کو زیادہ اہمیت دی۔

ضیاء گو کلب کو اسلامی قانون کا کوئی علم نہیں تھا لیکن ترکوں کا قومی شاعر ہونے کی وجہ سے سرکاری حلقوں میں اسے کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اس لیے حلیم ثابت کی بجائیں کے نظریات کو ترجیح دی گئی۔ وہ سرے سے تمام اسلامی فقہ کو دریا برد کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس بارے میں اس نے جو دلائل دیئے وہ ان کی اسلامی قانون اور قرآنی تعلیمات سے بے خبری پر دلالت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جدید کا تقاضا ہے کہ طلاق کے سلسلے میں مرد اور عورت کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں

اس طرح اسلامی قانون وراثت میں عورت کا جو نصف حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور اس کا خاتمہ ہونا چاہیے اور اس بارے میں ان کا استدلال یہ تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے قدیم اسلامی فقہ سے خلاصی کرائی جائے۔

ضیاء گو کلب کو اگر اسلامی قانون کا معمولی سا علم بھی ہوتا تو اسے ایسے اعتراضات کرنے کی ضرورت پیش ہی نہ ہوتی۔ اسلامی قانون میں مرد اور عورت دونوں کو علیحدگی کے برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ فرق صرف اصطلاح میں ہے۔ مرد اگر یہ حق استعمال کرے گا تو اسے طلاق کہا جائے گا اور عورت کے اس شرعی حق کو خلع کہتے ہیں۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد سوم ۳۹۳)

وراثت کے بارے میں بھی ان کا اعتراض ان کی کم علمی پر دلالت کرنا ہے۔ بلاشبہ لڑکے اور لڑکی کی صورت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف ہے اور اس کے حق میں بڑے وزنی شرعی دلائل ہیں لیکن جہاں تک تمام مردوں اور عورتوں یعنی ماں، بہن، باپ بھائی کا تعلق ہے تو اس بارے میں اسلامی قانون میں ان سب کے حصے برابر ہیں۔ دراصل ضیاء گو کلب جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کسی نہ کسی طرح اسلامی فقہ سے خلاصی چاہتے تھے اور ترکوں نے ان کی اس رائے کو اپنا کر، کوئی ترقی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اجتہاد کی اہمیت کے لئے جو ترک تجربے کا حوالہ دیا تو ہمارے علماء پر اس کا منفی اثر پڑا اور انہوں نے علامہ اقبال کی مخالفت شروع کر دی۔

اجتہاد کے اصول کو قابل عمل بنانے کے لئے، آخر میں علامہ صاحب نے تجویز پیش کی ہے کہ انفرادی علماء کو اس اصول سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ کام مسلمانوں کی قانون ساز اسمبلیوں کو کرنا چاہیے اس مقصد کے لیے علماء کی ایک معتدبہ تعداد کو ان اسمبلیوں میں شامل کر لینا چاہیے اس طرح، ان کا خیال ہے کہ اجتہاد کے اصول کو اپنانے میں کوئی غلطی نہ ہوگی اور عوام میں سے

اچھے ذہن رکھنے والے لوگ بھی اس بارے میں اپنی قیمتی آراء سے قوم و فائدہ پہنچا سکیں گے۔ (خطبات صفحہ: ۱۷۴) لیکن اس مقصد کے لیے علماء کے انتخاب کا انہوں نے کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا، کیونکہ یہاں کا ہر عالم دین اپنے آپ کو اس کام کا اہل سمجھتا ہے دوسرے یہ نہیں بتایا گیا کہ اسمبلی میں ان علماء کو کیا اختیارات حاصل ہوں گے اگر انہیں غیر اسلامی قوانین مسترد کرنے کا حق ہوگا، تو پھر اسمبلی کے دوسرے ممبروں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور اگر انہیں حق یہ تفویض نہیں کیا جاتا تو ان کا اسمبلی کا ممبر ہونا اسلامی قانون کی تدوین میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔

تاہم اس سلسلے میں علامہ صاحب نے ایک اور تجویز کا ضمنی طوید پر ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ اسلامی فقہ کے تمام ریکارڈ کا جدید علمی تحقیق کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور ان میں سے جو قوانین زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق نہیں ان کی بجائے قوانین مدون کئے جائیں۔ یہ ایک مناسب تجویز ہے لیکن اس بارے میں وہ علماء کے رد عمل سے گھبراتے ہیں کہ اس سے وہ ناراض ہو جائیں گے (خطبات - ۱۶۳) لیکن اگر ہم نے اسلامی قانون کی تشکیل جدید کرنی ہے تو پھر اس قسم کی ناراضگی سے نہیں گھبرانا چاہیے، میرے خیال میں ان خطوط پر اسلامی قانون کی تشکیل جدید کا کام فوری طور پر شروع ہونا چاہیے وگرنہ ہمارے ہاں ایسی تحریک شروع ہو سکتی ہے جیسی کہ ترکی شاعر ضیاء نے چلائی تھی کہ سرے سے اسلامی فقہ سے ہی گلو خلاصی کر لی جائے۔ اس سے ترکی قوم اسلام سے دور ہو گئی۔ اس لیے ہمیں اس انجام سے بچنے کے لئے اسلامی قانون کی تدوین جدید کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔ (نومبر ۱۹۸۷ء)





## مختلف اسلامی ادوار میں عدالتی نظام کا طریق کار

### دور رسالت کا طریق کار

دور رسالت، اسلامی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ یہ مبارک دور، بعد کے تمام ادوار کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر دور کے مسلمانوں نے حتیٰ الوسع اس اعلیٰ نمونہ کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں رسول اللہ صلعم کو لوگوں تک پیغام حق پہنچانے کا فریضہ سونپا تھا۔ وہاں لوگوں کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری بھی آپ کے کندھوں پر ڈالی تھی تاہم اس مبارک دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقویٰ غالب تھا اس لئے اگر ان کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا بھی ہوتا تھا تو وہ فریقین کا ذکر کئے بغیر اس کے بارے میں شرعی حکم معلوم کر لیتے تھے اور پھر اس پر بطیب خاطر عمل کر لیتے تھے۔ یہ طرز عمل، اسلام کے عدالتی نظام کا ہر دور میں رہا ہے۔ نیک لوگ عدالتوں میں جانے کی بجائے اپنے تنازعات کا فیصلہ ہمیشہ عدالتوں سے باہر کرتے رہے ہیں۔

ہاں اس مبارک دور میں دیہاتی عرب جو نئے نئے اسلام لائے تھے۔ وہ اپنے مقدمات رسول اللہ صلعم کی عدالت میں پیش کرتے تھے، آپ نے ان کے تنازعات

ے فیصلے کے لئے ایسے اصول مقرر کر دیتے تھے کہ وہ قیامت تک کیلئے مسلمان  
 حکمرانوں کے لئے رہنمائی کا کام دیتے رہے ام المؤمنین حضرت ام مسلمہ رضی اللہ  
 عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنے کسی تنازعے کے فیصلے کے لئے رسول اللہ  
 صلعم میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ میں بھی تمہاری طرح ایک  
 انسان ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک فریق اپنی چرب زبانی کے بل پر اپنے حق  
 میں ایسی دلیلیں پیش کرے جو دوسرا پیش نہ کر سکے۔ میں تو اپنی دلائل کے مطابق ہی  
 فیصلہ کروں گا جو میرے سامنے پیش کئے جائیں گے لیکن یاد رکھو کہ اگر کوئی شخص  
 میرے فیصلے کے باوجود اپنے بھائی کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طریقے سے حاصل کر لے  
 گا تو وہ اس کیلئے آگ کا ٹکڑا ہوگا، قیامت کے دن آگ کا وہ ٹکڑا اس کے گلے میں  
 پڑا ہوگا اور وہ پھکنی سے اسے اور زیادہ بھڑکا رہا ہوگا۔

رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد سن کر، وہ دونوں شخص رو پڑے اور ہر ایک نے کہا  
 کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول میں اپنا حق بھی اپنی خوشی سے اپنے بھائی کو دیتا ہوں۔  
 اس پر رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جاؤ اور جائیداد کو حق و انصاف اور شریعت  
 اسلامی کے احکامات کے مطابق تقسیم کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہونی  
 چاہیے کہ وہ دوسرے بھائی کے ساتھ ٹھیک اور درست معاملہ کرے گا۔

(مسند احمد بن حنبلہ کتاب القضاء)

اس دور میں عدالتی فیصلوں کی اولین بنیاد، قرآن مجید تھا، خود رسول اللہ صلعم  
 کسی معاملے کا فیصلہ کرتے وقت، سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع فرماتے  
 تھے لیکن جن معاملات کے بارے میں، وحی الہی میں کوئی حکم نہ ہوتا تھا، ان کے  
 متعلق آپ خود اجتہاد کرتے تھے اور بعض اوقات صحابہ کرام سے بھی مشورہ لیتے تھے  
 چنانچہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے افعال و اقوال، اسلام کے عدالتی نظام کی  
 دوسری بنیاد بن گئے۔ مختصر یہ کہ اس دور میں عدالتی فیصلے، قرآن مجید، سنت رسول

اور اجتہاد کے ذریعے کئے جاتے تھی۔

## دور نبوی میں عدالتی

دور نبوی میں نہ تو کوئی جیل خانے اور نہ ہی کوڑے مارنے کیلئے جلاہ مقرر تھے، عدالت شازو نادر ہی کوئی سزا دیتی، اگر کسی کو کوڑوں کی سزا دی بھی جاتی تھی تو اسے شرمندہ کرنے کیلئے ہوتی تھی، عام طور پر ایسے مجرم کو کپڑا کو اکٹھا کر کے یا جوتوں سے مارا جاتا تھا۔ اس دور کی سب سے مؤثر سزا سماجی مقاطعہ تھا۔ امام ابو داؤد نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک صحابی نے شاندار عمارت بنوائی تھی، جسے رسول اللہ صلعم نے ناپسند کیا اور اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا۔ آپ نے اس صحابی کا سماجی مقاطعہ کر دیا۔ جس سے اسے اپنے اس ناجائز فعل کا احساس ہو گیا اور اس نے جا کر اپنی اس شاندار عمارت کو گرا دیا۔ آپ نے شک کا فائدہ دیتے ہوئے، لوگوں پر شازو نادر ہی شرعی حدود کا نفاذ فرمایا۔ رجم کے بارے میں جو روایت ملتی ہے، علماء نے اس کے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ زنا کاری کے جرم کو شرعی حد کے احکامات نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

## عدلیہ دور صدیقی میں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد اعلان فرمایا کہ حکومت ان کے لئے باعث راحت نہیں بلکہ اس سے انہیں ایک عظیم معاملے کی تکلیف دی گئی ہے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہے بلاشبہ انہیں تم لوگوں کا امیر بنایا گیا ہے لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں راہ راست پر رہوں تو میری مدد کرنا۔ اور اگر بے راہ چلوں تو سیدھا کر دینا۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے۔ انشاء اللہ اسے اس کا حق دلو اوں گا۔ اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے۔ اس سے انشاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا۔

آپ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو سب سے پہلے آپ قرآن مجید

کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ پھر سنت رسول سے مدد لیتے۔ اگر آپ کو ایسا کوئی قول نہ ملتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں آکر دریافت کرتے کہ فلاں معاملے میں اگر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل معلوم ہو تو اطلاع دے جب ایسا کوئی عمل نہ ملتا تو صحابہ کرام میں سے جو اہل رائے تھے انہیں جمع کر کے مشورہ کرتے اور جس رائے پر اکثریت متفق ہو جاتی، اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ اس اصول کے مطابق اجتہاد صحابہ کا ذاتی فیصلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام اہل رائے صحابہ کا متفقہ فیصلہ ہوتا تھا۔

اپنے دور خلافت میں زیادہ تر مقدمات کے فیصلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خود کرتے تھے۔ لیکن جب آپ کی خلافت کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو آپ نے یہ خدمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی لیکن آپ کی زندگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی قابل ذکر مقدمہ ہی درج نہ ہوا کہ وہ اس کا فیصلہ کرتے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لوگ اپنے مقدمات عدالتوں میں لے جانے کی بجائے ان کے بارے میں شرعی احکامات معلوم کر کے خود ہی افہام و تفہیم سے فیصلہ کر لیتے تھے۔

### عدلیہ عہد فاروقی میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل آج تک ضرب المثل بنا ہوا ہے۔ ایک دفعہ دو فریق اپنا مقدمہ لیکر آپ کے پاس آئے تو آپ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ انہیں اس بارے میں روشنی عطا فرما کیونکہ ان میں سے ہر فریق ان کا دین چاہتا ہے۔ عدل قائم کرنے میں وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتتے تھے۔ اسلام کے اصول مساوات کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدالتی فیصلوں میں امیر و غریب والی اور رعیت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا قبیلہ غسان کے بادشاہ جملہ بن ایہم نے جب ایک غریب آدمی کو اس لئے تھپڑ مارا کہ اس غریب کا پاؤں، اس کے شاہی لباس پر پڑ گیا تھا تو آپ نے حکم دیا کہ وہ غریب آدمی اس کو ویسا ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔

مصر کے گورنر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک مصری کو بلاوجہ کوڑے مارے، تو حضرت عمرو بن عاص کو خدشہ ہوا کہ کہیں یہ مصری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر اس کی شکایت نہ کر دے۔ اس لئے اسے کچھ عرصے کے لئے قید میں ڈال دیا۔ تاہم وہ جب ہی قید سے رہا ہوا تو سیدھا مدینہ منورہ پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ آپ نے اس مصری کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے کو بلا بھیجا جب دونوں باپ بیٹے آپ کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے اس مصری شخص کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ جس طرح حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے اسے کوڑے مارے تھے، ویسے ہی وہ اسے کوڑے مارے۔ جب وہ جی بھر کر اس سے اپنا بدلہ لے چکا اور کوڑا امیر المومنین کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اسے فرمایا کہ وہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بھی چند کوڑے رسید کرے اللہ تعالیٰ کی قسم ان کے بیٹے کو اگر اپنے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا تو وہ تجھے ہرگز کوڑے نہ مارتا۔ پھر حضرت عمرو بن عاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

اپنی خلافت کے شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقدمات کے فیصلے خود کرتے تھے لیکن جب فتوحات کی وجہ سے انتظامی معاملات زیادہ ہو گئے تو آپ نے عدالتی فرائض کے لئے علیحدہ قاضی مقرر کئے۔ آپ نے سب سے پہلے یہ خدمت ایک صحابی حضرت ابو الدرداء کے سپرد کی۔ بعد میں جب کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہو گئے تو آپ نے حضرت شریح کو اس اہم شہر کا قاضی مقرر کیا جنہوں نے اس اہم عہدے پر پورے ساٹھ سال تک خدمات انجام دیں۔ اسلامی تاریخ میں آپ سب سے لمبی خدمات انجام دینے والے قاضی ہیں عہد نبوی اور عہد صدیقی کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی عدلیہ کی شان و شوکت اور عظمت قائم رہی اور اسلام کے بنیادی قانون مساوات کو مد نظر رکھتے ہوئے امیر غریب اور چھوٹے بڑے سب لوگوں

کو قانون کی نظر میں برابر سمجھا جاتا تھا چنانچہ خود خلیفہ بھی عدالت میں ایک معمولی فرد مملکت کی طرح حاضر ہوتے تھے۔

### عدلیہ حضرت عثمان کے دور میں

رسول اللہ صلعم کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بڑے ہی نرم دل حکمران تھے۔ شورش پسندوں نے آپ کی اس طبعی نرم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان شریکوں نے آپ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو عدالتی نظام قائم کیا تھا۔ ان کے عہد میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا۔ تاہم انہوں نے اس سلسلے میں ایک تبدیلی کی وہ یہ کہ اس سے پہلے عدالتوں کی کارروائی مساجد میں ہوا کرتی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لئے علیحدہ عمارتیں بنوائیں جو دار القضاء کے نام سے مشہور ہوئیں۔ آپ نے اگرچہ کچھ صوبوں کے گورنروں کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے والی مقرر کئے تھے لیکن آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ کسی قاضی کو نہیں بدلا تھا۔

### حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عدالتی نظام

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح خود اعلیٰ پایہ کے قاضی تھے۔ اس لئے رسول اللہ صلعم نے انہیں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ وہ آپ کے عدالتی نظام کو سوجھ بوجھ سے کافی متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہم سب میں سے علم قضاء کے بہت بڑے عالم ہیں اس لئے تو رسول اللہ صلعم نے انہیں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ (تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطی) آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ فرمایا کہ جب کبھی کوئی قابل اعتماد شخص انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سناتا ہے تو وہ اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرکاری قاضیوں کے علاوہ لوگ اپنے فیصلے

غیر سرکاری قاضیوں جنہیں بعد میں مفتی کہا گیا سے کراتے تھے۔ آپ اکثر مقدمات کے خود فیصلے کرتے تھے۔ تاہم دوسرے صوبوں میں آپ نے علیحدہ قاضی بھی مقرر کئے اس مقصد کے لئے اپنے صوبائی گورنروں کو جو خط لکھا اس میں یہ تحریر تھا کہ صرف ایسے شخص کو قاضی مقرر کیا جائے جو ہر لحاظ سے تمام رعایا میں بہتر شخصیت کا مالک ہو۔

مختصر یہ کہ خلافت راشدہ کے باسعادت دور میں 'عدالتی نظام' عہد رسالت کے عدالتی نظام کا مکمل نمونہ تھا۔ مساوات اسلامی کے اصولوں کی اس سختی سے پابندی کی جاتی تھی کہ خود خلیفہ وقت رعایا کے ایک عام فرد کی طرح عدالت میں حاضر ہوتا تھا اور اگر ان کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی جرم کا مرتکب ہوا تو اسے عام لوگوں کی نسبت زیادہ سخت سزا دی جاتی تھی۔ تاہم اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ شرعی حدود کے نفاذ پہلے اسلامی فلاحی مملکت قائم کی گئی جس میں معاشرے کے ہر فرد کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری حکومت نے لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب قحط کی وجہ سے حکومت یہ ذمہ داری پوری نہ کر سکی تو آپ نے شرعی حدود کا نفاذ بھی معطل کر دیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے عدالتی نظام کے نفاذ کیلئے اسلامی فلاحی مملکت کا قیام لازمی شرط ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد اموی اور عباسی خلفاء ہوئے اگرچہ انہوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلعم کا خلیفہ ہی کہا لیکن عملاً وہ دنیاوی بادشاہ تھے۔ بلاشبہ انہوں نے عدالتی نظام کو شریعت اسلامی کے اصولوں کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بالا آخر بادشاہ تھے۔ اسی لئے وہ اسلامی قانون کو مکمل پاسداری نہ کر سکے۔ لوگوں میں بھی پہلا جیسا تقویٰ نہیں تھا۔ اس لئے عدالتوں میں مقدمات کو بھرمار ہو گئی۔ اسلام کے امتیازی نظام عدل کی اہم خصوصیت کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حکمرانوں نے قاضیوں کے ساتھ 'مفتی بھی سرکاری طور پر مقرر کئے۔ جو اکثر مقدمات کا فیصلہ عدالتوں سے باہر کرتے تھے اس گئے گزرے زمانے میں بھی اسلام کے عدالتی

نظام کی یہ خصوصیت قائم ہے اور اکثر نیک لوگ اپنے مقدمات عدالتوں میں لے جانے کی بجائے ان کے بارے میں شرعی حکامات معلوم کر کے باہمی افہام و تفہیم سے ان کے فیصلے کر لیتے ہیں۔





## اسلامی عدالتی کی بنیاد قرآن حکیم

سنجیدہ قارئین کو یہ چیز عجیب معلوم ہوگی کہ قرآن مجید جیسی محکم کتاب کی کوئی آیت منسوخ بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے ہاں علماء کے ایک طبقے کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات منسوخ ہیں چہ تو یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک ان منسوخ آیات کی تعداد پانچ صد سے بھی زیادہ ہے۔ جس میں سے عام طور پر ۳۱۵ آیات کی نشاندہی کی جاتی ہے بقیہ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ منسوخ ہونے کی بنا پر انہیں قرآن مجید میں تو شامل نہیں کیا گیا لیکن ان کا حکم ابھی تک باقی ہے اس کی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ آیہ رجم پہلے قرآن مجید میں موجود تھی، پھر اسے قرآن مجید سے نکال دیا گیا۔ اس لئے نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت جائز نہیں۔ ”تاہم اس کا حکم اب بھی باقی ہے۔ جو شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کرنا ہے چنانچہ آج بھی قرآن آیات کے منسوخ ہونے کے بارے میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کرنے کی سزا ثابت نہیں کی جاسکتی۔

اسلامی معاشرے میں نسخ کے عقیدے نے اس وقت عروج حاصل کیا۔ جب یونانی فلسفہ و منطق نے اسلامی تعلیمات کے خلاف صف آرائی کی علماء جن آیات میں تطبیق نہ دے سکتے وہ انہیں منسوخ قرار دے دیتے تاہم اس دور میں بھی علماء کا ایک

طبقہ ایسا تھا۔ جنہوں نے قرآن مجید میں نسخ کا انکار کیا یہ لوگ اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی علمی و عقلی انداز سے مدافعت کی اور علمی و فکری دنیا میں اسلام کی عظمت کی دھاک بٹھادی۔ معتزلہ سے پہلے اسلامی تاریخ میں کسی ایسے فرقے کا سراغ نہیں ملتا۔ جو ماوراء الطبیعی مسائل میں عقلی و علمی انداز سے بحث کرتا ہو۔ کتنے اسلامی علوم ہیں۔ جو محض اس فرقے کی وجہ سے عالم وجود میں آئے۔ اور کتنے عقائد ہیں جو آج تک ہم میں رائج ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ کن اہل علم کی نکتہ سنجیوں نے یہ دقیق نکات کھولے تھے قرآن مجید کی آیات کے منسوخ ہونے کے انکار کا عقیدہ بھی انہی لوگوں کی علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ان لوگوں نے نسخ کے عقیدے کے خلاف یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید نص قطعی ہے اور اسے حدیث سے جو نص ظنی ہے۔ منسوخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ رہی یہ چیز کہ قرآن کی بعض آیات اس کی بعض دوسری آیات سے منسوخ ہیں تو یہ بھی غلط استدلال ہے کیوں کہ ایسا عقیدہ رکھنا کہ قرآن مجید کے بعض احکام بعض کے مخالف ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل بھی یہی دی ہے کہ اس کی آیات میں باہم تناقص ~~و اختلاف~~ نہیں اب جو لوگ بعض آیات کو دوسری آیت سے منسوخ مانتے ہیں انہیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ایسی آیات باہم مختلف ہیں۔ کیونکہ اگر اختلاف نہ ہو تو منسوخ قرار دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم خود نسخ کے مسئلہ کو غلط ٹھہراتا ہے۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں جس میں خود رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہو کہ قرآن کی فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہے۔ صحابہ کرام کے اقوال میں بعض آیات کے متعلق بے شک نسخ کا لفظ آیا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس آیت کو ایک صحابی منسوخ مانتے ہیں،

دوسرے اسی کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں۔ تو ہم اس صحابی کے قول کو کیوں نہ تسلیم کریں، جس سے قرآن مجید میں اختلاف نہیں ماننا پڑتا دراصل صحابہ کے اقوال میں لفظ نسخ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا۔ یعنی جب کبھی کسی آیت سے کسی صحابی کو غلط فہمی پیدا ہوئی اور دوسری آیت نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا تو ایسے موقع پر بھی وہ نسخ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ خود مفسرین میں بھی اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کسی ایک آیت کو منسوخ بھی تسلیم کرتے ہیں اور پھر اس کے غیر منسوخ ہونے کے بارے میں دوسرے اقوال بھی نقل کر دیتے ہیں۔ اگر بالفرض نسخ کے تمام اقوال کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن مجید کا بہت بڑا حصہ و نعوذ باللہ، محض بے کار ہو جاتا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے ان کی تحقیق کے مطابق پانچ صد آیات قرآنی کو منسوخ قرار دے دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اس بارے میں مفسرین کے اقوال کو رد کرتے ہوئے، صرف اکیس آیات کو منسوخ مانا۔ لیکن امام ابو مسلم اصفہانی نے ان اکیس آیات کو تفسیر کر کے ثابت کیا کہ قرآن مجید کی ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔

تاہم جو علماء اور مفسرین قرآنی آیات کے نسخ کے قائل تھے۔ انہیں ابو مسلم اصفہانی کی یہ کوشش پسند نہ آئی انہوں نے اسے معتزلہ قرار دے کر، ان کی چودہ جلدوں پر مشتمل تفسیر کو ضائع کرا دیا۔ اس لئے وہ تفسیر آئندہ نسلوں تک نہ پہنچ سکی۔ وگرنہ یہ عقیدہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس کے مقابلے میں ان ہی کے ایک ہم عصر مفسر حافظ ابو جعفر محمد بن اسماعیل کی کتاب النسخ و المنسوخ فی القرآن کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ اس مفسر نے قرآن مجید کی کوئی ۳۱۵ آیات کو منسوخ ثابت کیا تھا۔ ابو مسلم کی تفسیر ضائع کر دینے کی وجہ سے آئندہ نسلیں اس کتاب سے متاثر ہوتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے علماء کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات منسوخ ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کتاب کا مصنف نیم

پاگل تھا۔ اور آخری عمر میں اپنے اسی پاگل پن کی وجہ سے دریائے نیل میں چھلانگ لگا کر اس نے خود کشی کر لی تھی لیکن اس کے باوجود آج بھی اس کی کتاب کو قرآن مجید کی آیات کو منسوخ قرار دینی کے لئے سند سمجھا جاتا ہے۔

برصغیر ہندوپاکستان میں سب سے پہلے سید احمد خان نے قرآنی آیات کے منسوخ ہونے کا انکار کیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اس عقیدہ کے ماننے سے قرآن مجید کے محکم ہونے پر حرف آتا ہے لیکن سید احمد خان کے خلاف علماء نے ایک محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اس لئے ان کی اچھی باتوں کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم روشن خیال علماء ان کی تحقیق سے متاثر ہوئی بغیر نہ رہ سکے اور وہ قرآن مجید کے بارے میں اس عقیدے کی کمزوریاں واضح کرتی رہے لیکن یہ کوششیں محدود نوعیت کی تھیں۔ اس لئے ان کا اثر دیر پا نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ابھی حال ہی میں ایک مبسوط کتاب ”تفسیر منسوخ القرآن“ کے نام سے ملتان سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے مصنف رحمت اللہ طارق صاحب ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر موجود تمام مواد کو سامنے رکھ کر ان تمام اقوال کو جن کے حوالے سے قرآن مجید کی ۳۱۵ آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ علمی انداز میں رد کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر آیت کے بارے میں موجود مواد پر علیحدہ علیحدہ علمی بحث کر کے ان آیات کے منسوخ ہونے کے دعوے کو رد کر کے، قرآن مجید کی محکمیت کو ثابت کیا ہے اس طرح بڑی تفصیح کی ۹۰۶ صفحات پر مشتمل ایک عظیم کتاب تیار ہو گئی ہے جسے ادارہ ادبیات اسلامیہ، صرافہ بازار ملتان نے بڑی خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں نسخ و منسوخ کے موضوع پر اتنی سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ بحث کا کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں رہا۔ آج کی اصطلاح میں یہ اپنے موضوع پر ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے لیے علیحدہ ادارے کی ضرورت تھی لیکن علامہ رحمت اللہ طارق نے انفرادی طور پر اسے سرانجام دے کر دوسرے علماء کے لیے بھی ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے امید ہے کہ اگر ہمارے علماء نے اس تحقیق

کتاب کو خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا تو قرآن کی محکمیت پر ان کا یقین پختہ ہو جائے گا اور وہ کسی ایک آیت کے منسوخ ہونے پر بھی اصرار نہ کریں گے۔



## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مساوات محمدی

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجنے سے پہلے اس دنیا کی حالت بڑی دگرگوں ہو چکی تھی۔ اس دگرگوں حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ لوگوں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے خشکی اور سمندروں پر فساد برپا ہو چکا ہے (سورہ الروم - ۴۱) اس آیت میں قرآن مجید نے جس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یورپ کے محققین نے مختلف تاریخی ادوار کے بارے میں علمی تحقیق کے بعد اسے تسلیم کیا ہے۔ مشہور یورپی محقق مسٹر جے ایچ ڈینس اپنی انگریزی کتاب جذبات پر مبنی تہذیب میں رقمطراز ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں مہذب دنیا، تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ قدیم جذباتی تہذیب، جس نے کسی حد تک، انسانوں میں وحدت پیدا کر دی تھی، وہ اب ٹوٹ پھوٹ رہی تھی، دوسری کوئی تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے موجود نہیں تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عظیم الشان تہذیب، جسے تشکیل پانے میں چار ہزار برس، صرف ہوئے تھے۔ اب مٹنے کو ہے اور انسانیت ایک دفعہ پھر ظلم و بدبریت کا شکار ہونے والی ہے۔" (صفحات ۲۲۵ تا ۲۶۷)

مختصر یہ کہ اس وقت دنیا کو ایک ایسا ریفارمر کی ضرورت تھی جو اسے آنے والی

بتانی سے بچا سکے۔ اس وقت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ آپ نے مساوات پر مبنی ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جو تاریخ کے کسی بھی مہذب معاشرے سے برتر تھا۔ اس نئے معاشرے نے نہ صرف یہ کہ انسانیت کو بتاہی کے گھرے میں گرنے سے بچالیا، بلکہ اس وقت کی تمام اقوام کو، چاہیے وہ مہذب تھیں یا غیر مہذب، ایک وحدت میں پرو دیا یہ ایک نہایت ہی عظیم کارنامہ تھا۔ اور یہ کارنامہ صرف ایسا ہی انسان سرانجام دے سکتا تھا جو نہ صرف یہ کہ غیر معمولی قابلیت کا مالک ہو، بلکہ اخلاقی طور پر بھی اپنے زمانے کے لوگوں سے بلند تر ہو۔ اہل مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راست گوئی اور دیانت داری کے نبوت سے پہلے بھی قائل تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم، مکہ مکرمہ کے قریب صفاء کی پہاڑی پر تشریف لے گئے، آپ اہل مکہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے اس لئے آپ نے سردار ان مکہ کے نام لے لے کر انہیں بلایا۔ جب وہ سب آپ کے سامنے جمع ہو گئے تو آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک بہت بڑی فوج جمع ہے جو موقع پا کر تم پر حملہ کرنا چاہتی ہے تو کیا تم لوگ میری اس بات کا یقین کر لو گے۔ اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ وہ ضرور یقین کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اس فوج کے حملے سے بھی ایک بڑے خطرے سے دو چار ہونے والے ہو اور تمہیں اس خطرے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کے اس اعلان سے مکہ مکرمہ کے سرداران پر سراسیمگی چھا گئی۔ اور وہ خفا ہو گئے۔ انہوں نے آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ الٹا مخالف بن کر آپ کے دعوت کے کام میں رکاوٹیں پیدا کر کے آپ کو ہر طرح سے پریشان کرنے لگے۔ لیکن آپ نے کسی مخالف کی پرواہ نہ کی اور ان لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کے دن کے حق ہونے کی تبلیغ کرتے رہے۔ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ آپ پر ایمان لے آئے جس سے سرداران مکہ کے غصے میں مزید

اضافہ ہو گیا۔ اور انہوں نے آپ کے ساتھ ان بیکس مسلمانوں پر بھی ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیے۔

اسی اثناء میں عرب کے دوسرے بڑے شہر یثرب کے لوگوں نے آپ کی دعوت میں کشت محسوس کی اور ان کی ایک خاص بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ انہوں نے مسلمانوں پر کفار مکہ کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم پر بڑے دکھ کا اظہار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ سب ان کے شہر تشریف لے چلیں۔ چنانچہ آپ نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ اور مسلمانوں کے ساتھ یثرب کے شہر کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ کے وہاں جانے کے بعد یثرب شہر کا نام بدل دیا گیا۔ اور اب وہ مدینہ النبیؐ یعنی نبیؐ کے شہر سے مشہور ہو گیا۔ بعد میں اسے صرف المدینہ کہا جانے لگا۔

ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اسلامی کیلنڈر کی ابتداء اسی واقعہ سے کی گئی۔ مدینہ منورہ کے بہت سے سردار پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے انہوں نے اسلام کی دعوت خود رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے سنی اور فوراً ایمان لے آئے۔ اب آپؐ نے محسوس کیا کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے حالات سازگار ہو چکے ہیں چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپؐ نے مدینہ منورہ کے مختلف لوگوں کو جن میں یہودی اور عیسائی بھی شامل تھے متحد کرنا ضروری سمجھا۔

لوگوں کے ان مختلف طبقات سے مشورے کے بعد آپ نے معاہدے کے ایک مسودے کا خاکہ تیار کیا جسے سب فریقوں نے بخوشی منظور کر لیا اور جو بعد میں میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ مدینہ منورہ کا کوئی طبقہ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گا بلکہ اگر کسی دشمن نے حملہ کیا تو وہ تمام متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے مشن کو آگے بڑھایا گیا اور اس معاشرے کے قیام سے



اردگرد کے قبائل کے لوگوں کی زندگیوں پر خوشگوار اثرات پڑے اور انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات پر مبنی جو معاشرہ قائم کیا تھا وہ بعد کے مسلمانوں کے لئے بھی ایک بہترین نمونہ سمجھا گیا۔ انسانی معاشرے کو ہر دور میں جو سب سے اہم مسئلہ درپیش رہا ہے وہ ہے دولت کی نامساوی تقسیم۔ جو لوگ ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ لیتے تھے وہ بعد میں سیاسی طاقت بھی حاصل کر لیتے تھے۔ یہ کھیل ہر دور میں کھیلا جاتا رہا ہے اور ابھی تک کھیلا جا رہا ہے۔ جب دولت جمع کرنے کے لئے حقدار لوگوں کی محنت کا استحصال کیا جائے تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت چند ہاتھوں میں سمٹی جاتی ہے اور محنت کش لوگ اپنی محنت کا پھل حاصل کرنے سے محروم کر دیے جاتے ہیں اسے آج کل کی اصطلاح میں سرمایہ داری نظام کہا جاتا ہے۔ جس کا پاکستان سمیت دنیا کے بہت سے ممالک پر غلبہ ہے۔ سرمایہ دار حضرات سرمایہ پر اپنی اجارہ داری قائم کر لینے کے بعد سیاسی طاقت پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ اپنی اس طاقت کے بل بوتے پر دوسرے کمزور ممالک کے لوگوں کے استحصال کا پروگرام بناتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مختلف ملکوں کے درمیان لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں۔ یہ لڑائیاں مخلوق خدا کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے معاشرے سے ان خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے لیے عملی قدم اٹھائے۔ اس نظام کی بنیاد سود پر ہے اس لیے اسلامی تعلیمات کے مطابق سود کو انسانیت کے خلاف سب سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا گیا۔ قرآن مجید نے اسے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے برابر قرار دیا۔ رسول اللہ صلعم نے مختلف سودی معاملات کا خود بنفس نفیس جائزہ لیا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کا حکم دیا۔

سود کے حرام ہونے کے احکامات نازل ہونے کے بعد آپ منڈیوں اور کھیتوں

میں تشریف لے گئے۔ ایک کھیت میں ایک صحابی حضرت رافع بن خدیج کھیت کو پانی دے رہے تھے۔ آپ نے اس سے شکایت کے معاملے کی تفصیلات معلوم کیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمین کا مالک تو ایک غیر حاضر زمیندار ہے، وہ اس پر کام کر رہے ہیں۔ جب فصل ہوگی تو ادھی مالک کی ہوگی اور ادھی ان کی۔ ہمارے ملک میں اس معاملے کو بٹائی کا معاملہ قرار دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس معاملے کو خالص سود قرار دے دیا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ اسی طرح آپ نے آڑھت کے کاروبار اور غیر حاضر چیزوں کی خرید و فروخت کو بھی سود قرار دیا۔

بٹائی کے معاملے کو سود قرار دینے کے بعد بعض صحابہ کرام کے پاس ان کی خود کاشت سے زیادہ زمینیں ہو گئیں۔ آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اپنی زائد زمینیں مفت دے دیں۔ انہیں کسی صورت میں ان کی قیمت وصول کرنے کی اجازت نہ دی۔ اسی طرح آپ نے مکانات بنانے کے بارے میں بھی یہی حکم دیا کہ وہ خاندان کی ضرورت کے مطابق ہوں، شان و شوکت کے اظہار کے لیے نہ ہوں ایک دفعہ جب ایک صحابی نے ایک ایسی شاندار عمارت تعمیر کر لی جو اسے دوسرے صحابہ پر ممتاز کرتی تھی تو آپ اس صحابی سے اس حد تک ناراض ہوئے کہ اس کا سماجی مقاطعہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی شاندار عمارت کو زمین بوس کر دیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔

مساوات پر مبنی اسلامی معاشرے کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے خود رسول اللہ صلعم نے نہایت ہی سادہ زندگی گزاری۔ آپ اللہ کے نبی ہونے کے علاوہ اسلامی حکومت کے سربراہ تھے۔ آج کل حکومتوں کے سربراہوں کے لیے شاندار محل تعمیر کیے جاتے ہیں لیکن آپ نے ساری زندگی ایک حجرے میں گزار دی۔ یہی حال آپ کے لباس اور کھانوں کا تھا۔ آپ کی سادگی کو دیکھ کر تمام ایسے صحابہ کرام جن کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا انہوں نے بھی سادہ زندگی اپنائی۔ اور اس

طرح معاشرے کے تمام افراد کو وہ سہولتیں میسر ہو گئیں جو پہلے صرف چند لوگوں کو میسر تھیں۔ اس معاشرے میں کسی کو غریب محنت کشوں کی محنت کے استحصال کی اجازت نہ دی گئی۔ لوگوں کے پاس اگر ان کی ضرورت سے زیادہ مال اکٹھا ہو جاتا تو انہیں یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنے اس مال کو غریب لوگوں کی ضروریات پر صرف کریں۔ اس طرح معاشرے سے ہر قسم کی اونچ نیچ ختم ہو گئی۔ جرائم بھی کم ہو گئے اور لوگ امن و آشتی سے رہنے لگے۔ آج بھی اگر ہم نے پرسکون زندگی حاصل کرنی ہے تو ایسا ہی مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کرنا ہوگا۔ (فروری ۱۹۹۰)



## رسول اللہ صلعم۔ دنیا کے عظیم قانون دان

ہمارے علمی حلقوں میں ایک امریکی مصنف مائیکل ہارٹ کی کتاب بعنوان ”ایک صد تاریخ ساز عالمی شخصیتیں“ کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اہل پاکستان کی اس کتاب سے دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ مائیکل نے غیر مسلم ہونے کے باوجود ان تاریخ ساز شخصیتوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین مقام دیا ہے قارئین اس بارے راقم سے دریافت کرتے رہتے ہیں کہ مصنف نے دیانتداری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام اولین دیا ہے یا اس میں شرارت کا کوئی پہلو ہے اور یہ کہ وہ ایک صد عالمی شخصیتیں کون کون سی ہیں جنہوں نے تاریخ کے دھاروں کو بدل دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

راقم نے بھی اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا ہے لیکن ابھی تک اصل کتاب نظر سے نہیں گزری۔ تاہم خود امریکہ اور یورپ میں اس کتاب کی اہمیت کے مد نظر اس کے کئی خلاصے شائع ہو چکے ہیں۔ ان خلاصوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے تاریخی تجزیہ کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی تاریخ ساز شخصیتوں میں پہلا مقام دیا ہے کہ کتاب کے مصنف جناب مائیکل ہارٹ خود ایک ماہر فلکیات، ریاضی دان، قانون دان اور ماہر طبقات ہونے کے علاوہ

شطرنج کے عالمی کھلاڑی بھی ہیں اس نے عالمی شخصیتوں کا جو تاریخی تجزیہ کیا ہے۔ اسے اپنے مذہبی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا۔ وگرنہ ظاہر ہے کہ ایک عیسائی ہونے کے ناطے سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلا مقام دیتے اس نے اپنے تجزیے میں یہ واضح کیا ہے کہ اس نے جو فہرست مرتب کی ہے یہ بڑے انسانوں کی نہیں بلکہ ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس دنیا میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے چاہے ان میں سے بعض لوگ ظالم بھی مشہور ہوئے اسی اصول کے مطابق مصنف نے روسی ڈکٹیٹر شالن کو اپنی فہرست میں جگہ دی ہے جب کہ عیسائی مذہب کی کئی پاکیزہ ہستیوں جن میں مادام سیرینی بھی شامل ہیں ذکر تک نہیں کیا گیا مصنف کی کتاب کا خلاصہ ایک صحافی جناب جون امانگ نے تیار کیا تھا جو امریکی اخبار ہیرالڈ انٹرنیشنل ٹریبون کی ۲۴ دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا اس میں سے پہلی دس ہستیوں کے حالات، زندگی ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

## ۱۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۰ تا ۶۳۲ء)

آپ نے دین اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور عرب قبائل کو متحد کر کے ایک طاقت بنا دیا جس نے بحیرہ اوقیانوس سے ہندوستان کی سرحدوں تک کی وسیع مملکتوں کو فتح کیا اس دنیاوی کامیابی کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن مجید کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور لوگوں کے اسلام قبول کرنے میں اہم کردار ادا کیا آپ کی یہی دنیوی اور دنیاوی کامیابی جن کے اثرات آج بھی موجود ہیں حضرت محمد صلعم کو انسانی تاریخ میں واحد بااثر شخصیت ثابت کرتے ہیں۔

## ۲۔ اسحاق ٹیوٹن (۱۶۴۲ تا ۱۷۲۷ء)

آپ دنیا کے عظیم ترین سائنسدان تھے آپ نے سائنس کے تمام نظریات کی بنیاد رکھی جنہوں نے دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کیا نیوٹن نے دو سراٹیلی سکوپ ایجاد کیا اور روشنی کی حقیقت کے بارے میں بنیادی تحقیقی کام کیا اس نے علم ریاضی میں

کیلکولس ایجاد کیا اور حرکت کے چار بنیادی قوانین جو موجود علم طبیعیات کی بنیاد ہیں کی نشاندہی کی۔

### ۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (۶ء قبل مسیح تا ۳۰ء)

اس بات میں اختلاف نہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ تعداد عیسائی مذہب کے پیروکاروں کی ہے لیکن اسلام کی طرح عیسائیت کی کامیابی فرد واحد کی مرہون منت نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد و شخصیتوں یعنی حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال نے رکھی اور عیسائیت کے فروغ میں ان دونوں شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیا اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے دشمنوں سے محبت کی تعلیم دی اور برائی کا مقابلہ نہ کرنے کی تلقین کی اگر دنیا ان اصولوں کو تسلیم کر لیتی تو پھر بے شک دنیا کی تاریخ ساز شخصیتوں میں حضرت عیسیٰ کا مقام اولین ہوتا لیکن دنیا نے ان اصولوں کو تسلیم نہ کیا۔

### ۴۔ مہاتما بدھ (۵۶۳ تا ۴۸۳ قبل مسیح)

آپ بدھ مت کے بانی تھے آپ نے خود غرضی اور انسانی خواہشات کے خاتمے کی تعلیم دی کہ یہی انسانی دکھوں کی بنیاد ہیں بدھ مت کی کچھ تعلیمات کو ہندومت میں شامل کر لیا گیا۔

### ۵۔ کنفوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ قبل مسیح)

آپ بنیادی طور پر ایک اخلاقی فلسفی تھے آپ نے فرد اور حکومت کے تعاون کے بارے میں اصول پیش کیے آج کل اگرچہ چین میں ان کے اصولوں کو بھلا دیا گیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اگلے پچاس سو سالوں میں کنفوشس اور ماؤزے تنگ کے خیالات کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے۔

### ۶۔ سینٹ پال (۴ تا ۶۴ء)

عیسائیت قبول کرنے والا پہلا شخص تمام عیسائی مفکرین اور مستشرقین کے مقابلے میں اس نے عیسائیت پر دیرپا اثر چھوڑے اسی نے پیدائشی گناہ، حضرت عیسیٰ کی الوہیت اور گناہ کے کفارے کا عقیدہ پیش کیا اور موجود بائبل کی آدھی کتابیں اس کی لکھی ہوئی ہیں۔

۷۔ سوئی ٹن (۱-۵)

حکومت چین کا ایک بہت بڑا افسر تھا اس نے کاغذ ایجاد کیا تھا جس کی وجہ سے سوئی ٹن کے ایک ہزار سال بعد چینی تہذیب مغربی تہذیب پر سبقت لے گئی عربوں نے کاغذ بنانے کا فن چینیوں سے سیکھا اور پھر عربوں سے یورپ نے سیکھا۔

۸۔ جان گگن برگ (۲۰۰ تا ۱۳۶۸ء)

اس نے ٹائپ پریس ایجاد کیا اور اس کے لیے نئی قسم کی سیاہی تیار کی جس کی وجہ سے چھپائی کے فن نے ترقی کی اور موجودہ دور کی بے مثال ترقی کی اس ایجاد کی مرہون منت ہے۔

۹۔ کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱ تا ۱۵۰۶ء)

اگرچہ کولمبس پہلا شخص نہیں جس نے براعظم امریکہ دریافت کیا تھا تاہم اسے اس سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اور اس کے نتیجے میں لوگ نئے نئے علاقوں کی تلاش میں نکل پڑے۔

۱۰۔ البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹-۱۹۵۵ء)

بیسویں صدی کا ایک عظیم سائنسدان اور نابغہ روزگار شخصیت کا مالک تھا۔ انہیں نیوٹن کے بعد اس لیے رکھا گیا ہے کہ زمانہ جدید کی ٹیکنالوجی کی بنیاد نیوٹن کے نظریات پر رکھی گئی ہے۔ آئن سٹائن نظریہ اضافیت کا موجد ہے جس نے جدید علم طبیعیات کی تحقیق میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ (جون ۱۹۸۹)

## اسلامی مساوات اور کراچی کے مسائل کا اسلامی حل

کراچی ہمارے ملک کا سب سے بڑا شہر اور عظیم صنعتی اور تجارتی مرکز ہے ملکی صنعت کا زیادہ ارتکاز اسی شہر میں ہے جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں سے لوگ روزگار کی تلاش میں آکر یہاں بس گئے ہیں اسی بنا پر کراچی کو چھوٹا پاکستان بھی کہا جاسکتا ہے لیکن کراچی میں حالیہ واقعات ایسے غیر انسانی اور ظالمانہ تھے کہ جن کی وجہ سے ساری قوم پریشان ہو گئی ہے قومیتوں کے فساد کی وجہ سے ملک کو اربوں روپے کا صنعتی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے اور اب پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اس صورت حالات سے صرف اہل کراچی ہی کو نقصان نہیں ہوا بلکہ ساری قوم کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔

یہ پریشان کن صورت حالات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے دراصل اس صورت حالات کے پیدا کرنے میں بہت سے عوامل کا ہاتھ ہے لیکن افسوس ہے کہ ان عوامل کا صرف سطحی جائزہ لے کر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے سیاستدانوں کا کہنا ہے کہ یہ سیاسی مسئلہ ہے اس بارے میں وہ ایک سیاسی پارٹی پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے یہ صورت حالات



صوبے کے وزیر اعلیٰ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے کے لئے پیدا کی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ نے کراچی کارپوریشن کو برخاست کر کے ان کی سیاسی طاقت کو زک پہنچائی ہے بہت سے دوسرے سیاسی لیڈروں نے بھی اس کو دہرایا ہے۔ سینئر پیر صاحب پگوارہ جو ہمارے ملک کے عظیم سیاستدان ہیں نے بھی یہ الزام لگایا ہے کہ کراچی کی گڑ بڑ ایک سیاسی جماعت کی مسلم لیگ کے خلاف سازش کا نتیجہ ہے۔

تاہم صوبے کے وزیر اعلیٰ نے اصل حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ کراچی کے فسادات کا اصل وجوہ معاشی ہیں اور بعض سیاست دانوں نے ان معاشی وجوہ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صورت حالات کا اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو وزیر اعلیٰ صاحب کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ان معاشی وجوہ کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست کے طور پر قائم ہوا تھا۔ اور اس کے قیام کے وقت یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ ریاست ہر قسم کے استحصال سے پاک ہوگی ریاست کے بانیوں نے اعلان کیا تھا کہ نئی ریاست 'سامی انصاف' انسانی آزادی اور اسلام کے مساوات کے اصولوں پر قائم ہوگی۔ لیکن بد قسمتی سے پاکستان کی پچھلی چالیس سالہ تاریخ میں ان مقاصد کو حاصل نہیں کیا جاسکا۔ اس کی بجائے معاشرے کے مختلف طبقات میں معاشی فرق اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ جس کے نتیجے میں ان طبقات کے دلوں میں ایک دوسرے سے بغض اور نفرت پیدا ہو گئی ہے بڑے شہروں میں یہ معاشی تفاوت اور زیادہ گہرا ہے ایک طرف تو امراء کے اونچے اونچے محل نما مکانات ہیں جبکہ دوسری طرف غریب لوگ فٹ پاتھوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اس معاشی فرق کی وجہ سے غریب طبقے کے دلوں میں لاوا پکتا رہتا ہے جو کبھی کبھی فسادات کی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے۔

ہمارے ملک میں علامہ اقبال پہلے اسلامی مفکر تھے جنہوں نے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا۔ اس بارے میں جب انہیں ایسی موثر اسلامی تعلیمات کا علم ہوا کہ جن کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کیا جاسکتا ہے تو وہ بڑے خوش ہوئے اور اسے یورپ

کے سامنے ایک نادر فکر کے طور پر پیش کیا۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے دو حل تجویز کئے ہیں ایک یہ کہ ملک میں اسلام کے مساوات کے اصولوں پر معاشرہ قائم کیا جائے جس میں کم از کم ہر فرد معاشرہ کو سرچھپانے کی جگہ میسر ہوا اور اس کی دوسری ضروریات بھی آسانی سے پوری ہو سکتی ہوں دوسری یہ کہ بڑے شہروں کی آبادی پر حد لگائی جائے۔ جس سے زیادہ آبادی کو وہاں بڑھنے نہ دیا جائے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ اسلامی مساوات کے مطابق اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے مخصوص فرمایا جہاں تک بڑے شہروں کی آبادی محدود کرنے کا تعلق ہے اس کے بارے میں ان کے ایک دیرینہ دوست فقیر سید وحید الدین فرماتے ہیں کہ علامہ نے اس مسئلہ پر بہت سے یورپی مفکروں سے گفتگو کی تھی آپ نے جب اٹلی کے حکمران مسولینی کے سامنے یہ خیال پیش کیا تو وہ اسے سراہتے ہوئے اچھل پڑا۔ علامہ اقبال نے اسے بتایا تھا کہ یورپ کے بڑے شہروں کی آبادی بے ہنگم طریقے سے بڑھ رہی ہے، اسے روکنا چاہیے اور ہر شخص کے لئے آبادی کی ایک حد مقرر کرنی چاہیے مسولینی نے اس خیال کو پسند کیا اور اس کے مفید یا غیر مفید ہونے کی وجوہات دریافت کیں۔ علامہ اقبال نے اسے بتایا کہ بڑے شہروں میں آبادی کے اضافے کے ساتھ ان شہروں میں تہذیبی طاقتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ بری اور شریک طاقتیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ ان کا ذاتی خیال نہیں بلکہ یہ نظریہ پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ آپ نے مدینہ منورہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہوئے فرمایا کہ جب آبادی فلاں حدود تک پہنچ جائے تو پھر مزید آبادی کے لئے نئے شہر بسائے جائیں (روزگار فقیر حصہ اول ۴۲)

پاکستان واحد ملک نہیں جسے بڑے شہروں میں بڑھتی ہوئی آبادی کا یہ مسئلہ درپیش ہے دوسرے ممالک کو بھی کم و بیش ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ وہ جس طریقے سے اس مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ وہ

اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ ان طریقوں میں سے ایک روسی سائنسدان مسٹرولی۔ آرولیم کا نظریہ بڑی شہرت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے ذریعے بہت سے ملکوں میں گاؤں کی آبادیوں کو شہروں کی طرف منتقلی ہونے سے روکنے کے لئے ایسی موثر سکیمیں عمل میں لائی گئی ہیں کہ الٹا بڑے شہروں سے لوگ، گاؤں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے لوگ بے روزگار سے تنگ آکر ہی تو شہروں کا رخ کرتے ہیں اور جب انہیں اپنے گاؤں یا اس کے قریب ہی روزگار مل جائے تو اسے شہروں کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نظریے کے مطابق زرعی زمین کے ایک ہی قطعے کو ایک ہی وقت میں زرعی پیداوار، جنگلات اور ڈیری فارم کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ فارمی جنگلات میں درختوں کے نیچے کروڑوں ٹن گھاس پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ملک میں ضائع چلا جاتا ہے لیکن مسٹرولیم نے ان جنگلات کے ساتھ ڈیری فارم منسلک کر اس گھاس کو جانوروں کی خوراک کے طور پر استعمال کیا۔ جانوروں کے گوبر کو قدرتی کھاد کے لئے استعمال کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے ملک میں اس نظریے کے مطابق پنجاب کے علاقہ تھل میں ایک سکیم پر عمل کیا گیا اور اس کے مثبت نتائج نکلے۔ یہاں تک کہ حکومت نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ لاہور کا جانوروں کا ہسپتال اور کچھ دوسرے اداروں کو علاقہ تھل میں منتقل کر دیا جائے اس سکیم پر عمل کرنے کے لیے تین محکموں یعنی ذراعت جنگلات اور انیمل ہسپنڈری کا اوغام لازم تھا۔ ان محکموں کے افسروں نے بوجہ اس اوغام کی سخت مخالفت کی۔ انہیں ڈر تھا کہ انہیں لاہور چھوڑ کر تھل کے علاقے میں رہنا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے یہ اسکیم کامیاب نہ ہونے دی۔

اس اسکیم کو ترک کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دفعہ پھر دیہات کی آبادی نے تھل کے علاقے میں رہنے کی خواہش کی اور انہیں آبادیوں میں بڑھنے لگی۔ کراچی کے حالیہ واقعات اس بڑھتی ہوئی آبادی کی محرومیوں کا نتیجہ ہیں۔ بڑے شہروں میں آبادی کا ایک کثیر

حصہ ضروری سہولتوں سے محروم ہے جب کہ ایک اقلیت محل نما مکانوں میں رہتی ہے۔ یہ تفاوت معاشرے میں مختلف مسائل پیدا کرتا ہے کراچی کے حالیہ واقعات ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ کیوں کہ خطرہ ہے کہ دوسرے بڑے شہروں کو بھی جلد یا بدیر اس قسم کے واقعات سے دو چار ہونا پڑے گا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس مسئلہ کا جو حل پیش کرتا ہے۔ اسے فوراً اپنایا جائے۔ یعنی ایک تو اسلامی مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کیا جائے اور دوسرے بڑے شہروں کو آبادی کو محدود کیا جائے۔ ہمارا پڑوسی ملک اسی اصول پر عمل کر کے اس پریشان کن مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس بارے میں مزیدہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)



## اسلامی عدالتی نظام کے لئے اسلامی معاشرے کی تشکیل

متحدہ شریعت محاذ کی درخواست پر ۱۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو ملک بھر میں یوم شریعت بل منایا گیا۔ یہ محاذ تین دینی جماعتی یعنی جمعیت علمائے اسلام جماعت اسلامی اور جمعیت اہل حدیث پر مشتمل ہے۔ دوسری دینی جماعتوں مثلاً جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ نے اس کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیا بلکہ جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت اہل حدیث کے بعض سرکردہ علماء جو اپنے آپ کو ان جماعتوں کا حقیقی نمائندہ بتاتے تھے، نے اس بل کی سخت مخالفت کی۔

عوام کو شریعت بل سے متعارف کرانے کیلئے کچھ بڑے شہروں میں بعض انجمنوں کی جانب سے مجالس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ ان مذاکروں میں بل کے حامیوں اور مخالفوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا لیکن عجیب بات ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس مقصد کے لئے اسلامی معاشرے کی تشکیل کی بات تک نہ کی۔ حالانکہ شریعت بل کے نفاذ کے لئے اسلامی معاشرے کی تشکیل ایک ابتدائی ضرورت ہے۔

ہمارے علماء قیام پاکستان سے ہی ملک میں 'اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں انہوں نے مختلف اوقات میں جو من لہات پیش کئے

ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے بارے میں ابھی سوچا تک نہیں مثلاً کبھی تو یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلامیات کی تعلیم کو ہمارے نصاب تعلیم کا اہم جزو بنایا جائے۔ کبھی شرعی حدود کے نفاذ کو اس مقصد کے لئے کافی سمجھا گیا۔ اور یہ دعوے کیا گیا کہ ان کے نفاذ سے ہمارا معاشرہ اسلامی بن جائے گا۔ کچھ سادہ لوح لوگوں نے انگریزی لباس کی بجائے شلوار قمیض پہننے کو اسلامی معاشرے کی تشکیل قرار دیا۔

حکومت نے یہ سارے مطالبات مان لئے تھے اسلامیات کو پرائمری جماعتوں کے نصاب سے لیکر یونیورسٹی تک نصاب کا ایک اہم حصہ بنا دیا گیا۔ شرعی حدود نافذ کر دی گئیں اور انگریزی لباس کی بجائے شلوار قمیض پر مشتمل قومی لباس اپنا لیا گیا لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے سے جرائم کم ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہونے لگا۔ مساجد میں نمازیوں کی تعداد پہلے سے بھی کم ہو گئی رشوت میں اضافے کو تو سرکاری سطح پر بھی تسلیم کیا گیا۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں 'لوگوں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جن کے خیال کے مطابق اسلامی نظام موجودہ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور چودہ سو سالہ پرانے قوانین کو نافذ کر کے 'معاشرے کو پیچھے کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے ہمارے علماء کی جانب سے ایسے لوگوں کی وقتاً فوقتاً مذمت کی جاتی رہی ہے لیکن اسلامی نظام کے سلسلے میں مذکورہ بالا اقدامات سے متوقع نتائج برآمد نہ ہونے کو انھوں نے اپنے غلط نقطہ نظر کی تائید میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے علماء کو اس صورت حال پر غور کرنا چاہیے اور ناکامی کے اصل اسباب معلوم کرنے چاہیں یوم شریعت پر علماء نے اپنی تقریروں میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت اس ضابطے کو ملک میں نافذ کرانا چاہتی ہے۔

اگر ہمارے علماء اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں پچھلے نو سال میں اٹھائے گئے

اقدامات کا غور سے مطالعہ کرتے تو ان پر اصل حقیقت آشکار ہو جاتی۔ مثلاً اس سلسلے میں سب سے بڑا اقدام شرعی حدود کا نفاذ تھا لیکن اس قانون کا تعلق معاشرے کے ایک محدود گروہ یعنی مجرموں سے تھا۔ اگر اس کے مثبت و نتائج بھی نکلتے تو بھی عامتہ الناس کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔ عوام کو تو معاشی اور سیاسی عوامل ہی متاثر کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی معاشرے کی تشکیل، سیاسی اور معاشی بنیادوں پر ہی ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اپنے اس دعوے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کو بار بار دہرانے کے باوجود ہمارے علماء نے ابھی تک عوام کے سامنے اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کا کوئی خاکہ تک پیش نہیں کیا۔

دراصل ان دونوں معاملات پر علماء کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ اس لیے وہ اس بارے میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بغیر اسلامی معاشرے کی تشکیل ہی ممکن نہیں اسلامی تعلیمات کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ کام کرنے کے قابل، ہر آدمی محنت کر کے اپنی روزی کمائے اور جو لوگ محنت سے کمانے کی بجائے۔ دوسروں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں، اسلام انہیں اپنا دشمن قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں سود کے احکامات کے نازل ہونے کے بعد، غیر حاضر زمینداری کے نظام کو جو اس وقت استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ خلاف اسلام قرار دے کر اس کے حرام ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور اس بارے میں یہاں تک فرما دیا کہ جو اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے پر تیار ہو جائے۔ (سنن ابو داؤد)

لیکن ہمارے علماء نے قیام پاکستان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانب سے اس حرام کردہ معاملے کو جائز قرار دے دیا یہی نہیں بلکہ اسے اسلامی ثابت کرنے کے لیے اس کی تائید میں مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ خیال رہے کہ اسلام کے مالیاتی نظام کی بنیاد ہی، غیر حاضر زمینداری نظام کے خاتمے پر ہے کاشتکاروں سے جو حصہ پیداوار غیر حاضر زمیندار ہتھیار کر لے جاتے ہیں۔ دراصل وہ اسلامی

ریاست کا مالیہ ہوتا ہے۔ اتفاق سے ۱۹۷۷ء میں اس سلسلے میں ہمارے علماء کو ایک عجیب صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت انہیں غیر حاضر زمینداری کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا احساس ہو۔

ان علماء نے حکومت وقت کے خلاف قومی اتحاد کے نام سے ۱۹۷۷ء میں ایک اتحاد قائم کیا تھا۔ جس میں پاکستان کی تمام دینی جماعتوں کے علماء شامل تھے۔ ملک کی سیاسی صورت حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد، قومی اتحاد نے یہ محسوس کیا کہ ملک میں سیاسی افراتفری کی ذمہ داری بڑے بڑے غیر حاضر زمینداروں کی ذاتی مفاد کی کارروائیاں ہیں۔ چنانچہ اس صورت حالات نے انہیں مجبور کیا کہ اس بارے میں وہ اپنے سابقہ غلط فتویٰ سے رجوع کریں چنانچہ تمام دینی جماعتوں کے علماء نے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ شریعت اسلامی میں غیر حاضر زمینداری کا کوئی تصور نہیں اور یہ کہ قومی اتحاد، انتخابات میں کامیابی کے بعد اس غیر اسلامی معاملے کو ختم کر دے گا۔ قومی اتحاد نے اپنا یہ اعلان اپنے منشور کے صفحہ ۱۶ پر بھی درج کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے سے غیر حاضر زمینداری کے نظام کے خاتمے کے بعد ہی اس کی اسلامی خطوط پر تشکیل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت یہی لوگ ہماری سیاست پر چھائے ہوئے ہیں اور اپنی بے حد و حساب دولت جو انہوں نے بغیر محنت کے حاصل کی ہوتی ہے، کی مدد سے یہ قانون ساز اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ظاہر ہے وہ کسی بھی صورت میں ایسے کسی قانون کو پاس نہیں ہونے دیں گے جس سے غیر حاضر زمینداری نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک نہ تو اسلام کے سیاسی نظام کے نفاذ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی اور نہ ہی اسلام کے معاشی نظام کی کوئی قابل عمل صورت پیش کی جاسکی۔

امید کی جاتی ہے کہ شریعت بل کے علمبردار علماء ان تفصیلات پر غور فرمائیں گے اور اپنے آپ کو شریعت بل پاس کرانے کے مطالبے تک محدود کرنے کی بجائے وہ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں بھی تگ و دود کریں گے۔ اوپر دی گئی



تفصیلات سے یہ حقیقت واضح کی جاچکی ہے کہ صرف شریعت بل کے پاس ہو جانے سے ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں بن جائے گا۔ بلکہ اسلام کے سیاسی اور معاشی اصولوں کے مطابق اس کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔ اس امر کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کا متفقہ خاکہ، عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس خاکے کے مطابق اسلام معاشرے کی تشکیل کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ شریعت بل کے نفاذ سے متوقع نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ (مرقومہ نومبر ۱۹۸۶ء)





شرعی عدالت میں حاضر ہو کر اس نے اس برائی سے آئندہ کے لیے اپنے تائب ہونے کا اعلان کیا، عدالت نے اس کے جرم اور دوسرے متعلقہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ مجرم کو فوری سزا دینے کی بجائے، اصلاح کا موقع دیا جائے اور اس مقصد کے لئے اسے لاہور کے ایک نگران افسر کی نگرانی میں ایک سال کے لئے سونپ دیا۔ اس عرصے کے دوران اس کے لئے لازمی ہو گا کہ وہ اچھے چال چلن کا مظاہرہ کرے اور نشہ آور چیزوں سے دور رہے، وہ مہترہ افسر کو اپنے اچھے چال چلن کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے ہر ماہ اس کی خدمت میں حاضر ہو گا اور وہ افسر ایک سال کا عرصہ گزرنے کے بعد اس شخص کے چال چلن کی بابت عدالت کو رپورٹ کرے گا۔ عدالت نے مزید حکم دیا کہ یہ مقدمہ ایک سال کے بعد پھر پیش کیا جائے اور اگر ملزم نے اس دوران اچھے چال چلن کا ثبوت نہ دیا تو پھر اس کے خلاف شرعی احکام کے مطابق مناسب کارروائی کی جائے گی۔

یہ فیصلہ اسلام کے عدالتی نظام کی روح کے عین مطابق ہے لیکن اس اسلامی روح کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے کہ جرائم کی سزا کے بارے مختلف انسانی معاشروں میں کیا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے ہر معاشرے میں دعویٰ تو یہی کیا جاتا ہے کہ مجرموں کو سزائیں اس لئے دی جاتی ہیں کہ ایک تو معاشرہ ان کے کئے ہوئے جرائم کے مفاسد سے پاک کیا جائے اور دوسرے مجرموں کی اصلاح کی جائے۔ لیکن قارئین جانتے ہیں کہ اس سزا کے لئے عام طور پر جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، ان میں انتقام کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے اور حکام مجرموں کو سزا دے کر اپنے جذبہ انتقام کو تسکین دیتے ہیں اس سلسلے میں کا ”ڈرائنگ روم“ والا طریقہ عالمی شہرت اختیار کر چکا ہے۔

انتقامی سزا کے اصول پر آج سے ہزاروں سال پہلے رومن ایمپائر میں عمل ہوتا تھا اور مجرموں کو سزا کم بلکہ عملاً ان سے انتقام لیا جاتا تھا۔ یورپ میں کئی صدیوں تک اسی اصول پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں اس طریقے کو خلاف

انسانیت سمجھتے ہوئے اس میں کچھ نرمی ضرور اختیار کی گئی ہے۔ لیکن اسے بالکل ترک نہیں کیا گیا اور جہاں ایشیا میں ان اہل مغرب کی حکومت رہی ہے وہاں تو یہ طریقہ اپنی پوری سختیوں کے ساتھ اب بھی مروج ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجرم میں بھی جذبہ انتقام پرورش پانا شروع ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ جرائم کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ پکا مجرم بن جاتا ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ معاشرے سے جرائم کے خاتمے کے لئے مجرموں کو سخت سزا دینے کی ضرورت ہے اور اسلام نے بھی اس مقصد کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ ان سزاؤں کی بارے میں فرماتے ہیں۔ بعض جرائم کے ارتکاب پر شریعت اسلامیہ نے شرعی حدیں مقرر کی ہیں۔ یہ جرائم ایسے ہیں کہ ان کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا ہے۔ نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا ہے اور مسلم معاشرے کی طمانیت اور سکون قلب رخصت ہو جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ جرائم کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دو چار بار، ان کا ارتکاب کرنے سے ان کی بری عادت پڑ جاتی ہے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے جرائم سے باز رکھنے کے لئے محض آخرت کے عذاب کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ضروری ہے کہ ان ارتکاب پر ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب ساری عمر معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور دوسرے افراد کے لئے باعث عبرت بن جائے۔ اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرائم کرنے کی جرات کریں۔ اس کی ایک واضح مثال جرم زنا ہے، زنا کا محرک، نفسی خواہش کا غلبہ ہے عورتوں کے حسن و جمال سے اس جذبے کو تقویت ملتی ہے، اور یہ ایک ایسا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے عورت کے اہل خاندان کو سخت رسوائی اٹھانی پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے کشت و خون ہوتا ہے، چونکہ اکثر یہ فعل فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی چوری چھپے۔ اس

لئے اگر اس کی سزا عبرت ناک نہ رکھی جاتی تو اس برائی کے پھیل جانے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی۔ (حجتہ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ۱۵۸)

اسلام نے مختلف جرائم کی سزائیں بلاشبہ سخت مقرر کی ہیں اور ان کا مقصد وہی ہے جو اوپر شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے، لیکن اسلام میں ان سزاؤں کی بنیاد محبت اور شفقت پر ہے اور رومن قانون کی طرح انتقام پر نہیں، یہ ایسی سزائیں ہیں جیسی کہ باپ اپنے غلط کار بیٹے کی اصلاح کے لئے اسے دیتا ہے یا بعض اوقات ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کی تادیب کے لیے ایسا کرتا ہے۔ ان سزاؤں کے ذریعے مجرموں کی اصلاح کی جاتی ہے اور معاشرے سے بدی کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس بارے میں قرآن مجید احادیث نبویؐ اور اسلامی فقہ سے کافی رہنمائی ملتی ہے، اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

کیا انہیں خبر نہیں کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا ہے اور (اس کے لئے) صدقات بھی قبول فرماتا ہے اور اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا ہے اور اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ عمل کرو تمہارے اعمال کو اللہ، اس کا رسولؐ اور مومن جانچیں گے اور تم اسی ظاہر و باطن کو جاننے والے اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہارے اعمال سے تمہیں مطلع کرے گا۔“ (سورہ التوبہ آیات ۱۰۴، ۱۰۵) (جولائی ۱۹۸۵)





دو سمراتھ

اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد

مذہب  
پورا  
بات  
مکمل  
ہیں۔



## اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ میں رکاوٹیں

متحدہ شریعت محاذ کے سیکرٹری اطلاعات جناب زاہد الراشدی صاحب کی جانب سے ۱۱ نومبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں ایک بیان چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے ملک کے دانشور طبقہ سے اپیل کی ہے کہ وہ شریعت بل کے نفاذ کے لئے جدوجہد میں شریک ہوں اور اگر مفروضات کی بجائے حقائق اور عملی ضروریات کے شریعت بل کی کسی دفعہ پر انہیں نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو انہیں اس کی نشاندہی کرنی چاہیے، متحدہ شریعت محاذ نے نہ تو اس سے قبل ضروری ترمیم کو وقار اور انا کا مسئلہ بنایا ہے اور نہ ہی آئندہ اسے کسی مفید تجویز یا ترمیم کو قبول کرنے میں کسی قسم کا تامل ہوگا۔

اپنے اسی بیان میں انہوں نے یہ دعوے بھی کیا ہے کہ ہمارا سارا معاشرہ مذہب کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتا ہے پورے مسلم معاشرے سے اہل مذہب اور الگ حیثیت سے پیش کرنا اگر محض اتفاقی بات نہیں ہے تو یہ ملک کی غالب اکثریت کے ساتھ سنگین زیادتی ہے جو اسلام کو مکمل ضابطہ حیات سمجھتے ہوئے اس کے زندگی کے ہر شعبے میں عملی نفاذ کے خواہاں ہیں۔

ہمارے ہاں یہ دعوے تو قیام پاکستان کے وقت سے کیا جا رہا ہے کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہاں کے مسلمان، زندگی کے ہر شعبے میں اس کے عملی نفاذ کے خواہاں ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ عوام تو کجا، خود ہمارے علماء حضرات کو اس مکمل ضابطہ حیات کی تفصیلات کا علم نہیں۔ اور اسی لاعلمی کی وجہ سے وہ حال ہی میں ایک ایسے اقدام کی تائید کر چکے ہیں۔ جو شریعت بل کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ اقدام آئین میں نویں ترمیم کے ذریعے، اسلام کے سب سے اہم اور متفقہ معاملے کو ہمیشہ کے لئے پس پست ڈالنا ہے۔

اس ترمیم کے ذریعے دو اہم معاملات، جنہیں پہلے قانونی تحفظ حاصل تھا اور وہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ انہیں عدالت کے دائرہ کار کے تحت لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ دو معاملات، عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء اور دوسرا سرمایہ داری نظام کا مالیاتی ڈھانچہ ہے جو ہمارے ملک پر مسلط ہے۔ ان معاملات کے سلسلے میں اس ترمیم میں کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ جس کے نتیجے میں، عائلی قوانین کو تو مزید کوئی تحفظ نہیں دیا گیا جبکہ اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام کو جس کی بنیاد ہی سود پر ہے اور جو قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہے، اسے کچھ مزید تحفظ دیا گیا ہے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شریعت بل کے بعض علمبرداروں کی جانب سے اس ترمیم کو سراہا گیا ہے۔

سرمایہ داری نظام کو مزید تحفظ دینے کیلئے ترمیم کی دفعہ (۹۳) کے ذیل میں یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ اگر وفاقی شرعی عدالت، کسی مالیاتی معاملے کو اسلامی امور کے ماہرین کے مشورے سے اسلامی احکامات کے خلاف قرار دے دے تو اس سلسلے میں، متبادل انتظام کے لئے مناسب تجاویز دے اور اس خلاف اسلام قانون کو تبدیل کرنے کی مناسب مہلت بھی دے۔ پھر ذیل دفعہ (۳ ب) کے مطابق مالیاتی امور سے متعلق خلاف اسلام قرار دیئے گئے قوانین بھی اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے کہ جب

تک قانون ساز اسمبلیاں اس بارے میں نئے قوانین نہیں بنا لیتیں خیال رہے کہ اسلام کے مالیاتی نظام کی بنیاد غیر حاضر زمینداری نظام کے مکمل خاتمے پر استوار ہوتی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے ہماری قانون ساز اسمبلیوں کے زیادہ تر اراکین اسی طبقے سے منتخب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یہ لوگ کبھی بھی ایسے نظام کی حمایت نہیں کریں گے کہ جس سے غیر حاضر زمینداری کا نظام ملک عزیز سے ختم ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہاں اسلام کا مالیاتی نظام کبھی بھی نافذ نہ ہو سکے گا۔

آج دنیا کے مختلف سیاسی نظاموں پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی اصل پہچان، ان کے مالیاتی نظام ہیں مثلاً سرمایہ داری نظام اپنے بے حد و حساب ملکیت کے نظریے اور سوشلزم ملکیت کی تحدید اور عوام کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے کے نظریے کی بنا پر مشہور ہیں۔ اسلام کا مالیاتی نظام ان دونوں نظاموں سے بنیادی طور پر مختلف ہے کیونکہ اس میں کسی دنیاوی ٹیکس کی گنجائش نہیں۔ علامہ عبدالوہاب الشعرانی نے تمام فقہائے اسلام کا اس امر پر اجماع نقل کیا ہے کہ اسلام کے مالیاتی نظام میں کوئی دنیاوی ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔ (المیزان الکبری جلد دوم ۲)

ہمارے علماء پچھلے چالیس سال سے اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا دعوے کر رہے ہیں، لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک اس کا کوئی نامکمل سا خاکہ بھی عامتہ الناس کے سامنے پیش نہیں کر سکے بلکہ اس کی تفصیلات سے عدم واقفیت کی بنا پر وقتاً فوقتاً اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام کا مالیاتی نظام ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر امت مسلمہ کے تمام فقہی مذاہب کا مکمل اتفاق ہے لیکن اتفاقی مسئلہ کو پس پست ڈال کر، ہم اختلافی بحثوں میں الجھ گئے ہیں اور اس طرح قرآن مجید کے اس سنہری اصول کی مخالفت کر رہے ہیں جس میں فرزند ان توحید کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ان میں بعض مسائل میں اختلاف ہو تو پھر ایسے مسائل کو پہلے اپنا وجہ پر تمہارا کائنات اتفاق ہو۔ ارشاد ہے

(ترجمہ) اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو آپ کے اور ہمارے درمیان متفقہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اسلام کے مالیاتی نظام کی بنیاد غیر حاضر زمینداری کے خاتمے پر ہے۔ اس نظام کے مطابق زمین اصل کاشت کار کے پاس ہی رہتی ہے اور وہ اس کا ایک حصہ پیداوار اسلامی ریاست کے حوالے کرتا ہے جس سے اسلامی ریاست کے اخراجات پورے ہوتے تھے لیکن آج کل وہ پیداوار کا یہ حصہ ان غیر حاضر زمینداروں کے حوالے کر دیتا ہے جن کا اسلامی تعلیمات میں تو کوئی وجود نہیں انگریز بنگال کے ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی کے ذریعے انہیں وجود میں لایا حیرت کی بات ہے کہ ۱۹۷۷ء کی قومی اتحاد کی تحریک کے موقع پر علماء کی تمام جماعتوں نے یہ متفقہ اعلان کیا تھا کہ اسلام میں غیر حاضر زمینداری کی کوئی گنجائش نہیں اور اسے قومی اتحاد کے منشور کے صفحہ ۱۶ پر درج بھی کر دیا گیا اور اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ قومی اتحاد برسر اقتدار آنے کے بعد غیر حاضر زمینداری کے نظام کو ختم کر کے زمین اسی کاشت کار کے پاس رہنے دے گا جو اس میں عملاً کاشت کرتا ہوگا قومی اتحاد کا یہ منشور تمام قومی اخبارات میں چھپا تھا اور اس وقت کسی عالم دین نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا جسے اسلامی اصطلاح میں اجماع کہتے ہیں لیکن آج یہ تمام دینی جماعتیں اپنے اس دعوے کو بھول چکی ہیں اور ایک دفعہ پھر غیر حاضر زمینداری نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسلام کے مالیاتی نظام کے نفاذ کی عملاً مخالفت کر رہے ہیں یعنی ایک طرف وہ شریعت بل کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ کو خود اپنے عمل سے مزید پختہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ملک کے دانشور طبقے سے اس کے نفاذ میں مدد کی اپیل کر رہے ہیں امید ہے متحدہ شریعت محاذ کے سیکرٹری اطلاعات صاحب اس بارے میں وضاحت کریں گے کیونکہ وہ قومی اتحاد کے بھی ایک سرگرم رکن تھے۔ (نومبر ۱۹۸۶)



## اسلامی قانون کے نفاذ کیلئے واضح طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت

ان دنوں شریعت بل کے سلسلے میں ملک عزیز میں خوب گہما گہمی ہے اس بل کے علمبردار اور اس کے مخالف اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ جلسے منعقد کر رہے ہیں۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو شریعت بل کے علمبردار علماء کے متحدہ شریعت محاذ نے لاہور میں کل پاکستان علماء اور مشائخ کنونشن کا انتظام کیا اس کنونشن میں شریعت بل کے حق میں بڑی زور دار تقریریں کی گئیں اور کنونشن میں شریک علماء اور مشائخ کی جانب سے یہ دو ٹوک اعلان کیا گیا کہ یا تو حکومت کو شریعت بل منظور کرنا ہو گا یا کرسی چھوڑنا پڑے گی۔ کنونشن میں ملک بھر میں شریعت بل کی حمایت میں تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے قومی اسمبلی کا گھیراؤ بھی کیا جائے گا۔

اس کنونشن کی تفصیلات کے ساتھ ہی اسی تاریخ کے قومی اخبارات (۲۷- اکتوبر ۱۹۸۶ء) میں اس بل کے ایک مخالف کنونشن کی کارروائی بھی شائع ہوئی ہے۔ یہ کنونشن جماعت اہل سنت کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا اور اس کے مرکزی اجلاس

میں متفقہ طور پر پرائیویٹ شریعت بل کو مسترد کر دیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ شریعت بل ایک ڈھونگ ہے۔

پاکستان میں بسنے والے ہر مسلمان کی یہ دلی خواہش ہے کہ اس ملک میں شریعت اسلامی کا نظام نافذ ہو لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے بڑی روکاوت شریعت اسلامی کے بارے میں ہمارے علماء کا عجیب و غریب طرز عمل ہے جس کی ایک جھلک اوپر بھی دکھائی گئی ہے۔ خود شریعت بل کے علمبرداروں کا طرز عمل اس سے بھی عجیب تر ہے اور اب تک وہ شریعت بل کے تین مسودے بدل چکے ہیں۔ اس کا پہلا مسودہ تیرہ جولائی ۱۹۸۵ء کو پاکستان کی مجلس شوریٰ کے ایوان بالا میں پیش کیا گیا اور اس کے بارے میں یہ دعوے کیا گیا کہ وہ اسلام کی خالص اور مستند تعلیمات پر مشتمل ہے لیکن چودہ ماہ بعد خود شریعت بل کے مجوزین نے اس میں ترمیمات کے ذریعے اس کی شکل بگاڑ دی اور ابتدائی سادہ بل کو سترہ دفعات پر مشتمل ایک بھاری بھر کم بل بنا کر عوام کے سامنے پیش کر دیا اور اس کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ خالص اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے اور اسلامیان پاکستان کی دلی آواز ہے لیکن اس ماہ اس میں ایک دفعہ پھر ترمیمات کے ذریعے اس کی شکل بدل دی گئی ہے اور اس کے اسلامی ہونے کے بارے میں وہی دعویٰ کیا گیا۔ جو پہلے دو بلوں کی بابت کیا گیا تھا۔

شریعت بل میں ان بار بار کی ترمیمات سے عوام تو کجا اچھے بھلے اہل علم پریشان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انجمن طلبہ مدارس عربیہ کے اراکین نے اس بارے میں وضاحت حاصل کرنے کے لئے حالیہ کنونشن کے پنڈال کے باہر ایک منظم مظاہرہ کیا اور انہوں نے کنونشن کے اراکین سے چند سوالوں کے ذریعے شریعت بل کے ابہامات کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس کے بارے میں انہوں نے مندرجہ ذیل اعلامیہ اشاعت کے لئے اخبارات و ارساں کیا جو ان الفاظ میں شائع کیا گیا۔

انجمن طلبہ مدارس مرہیہ پاکستان نے ایک اعلامیہ میں کہا ہے کہ جامعہ نعیمیہ میں منعقد ہونے والے کل پاکستان نفاذ شریعت کنونشن کے دوران اکابرین کنونشن نے ان کے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے راہ فرار اختیار کی۔ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ انجمن کے چند ارکان نے تحریری طور پر چند سوالات کے۔ مگر کسی بھی مقرر نے شریعت بل کے بارے میں کوئی وضاحت نہ کی شریعت بل میں موجود ابہامات کو دور کرنے کے لئے سوالات کا جواب دینے کے لئے اکابرین نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا مگر جوابات دینے سے قاصر رہے اعلامیہ میں کہا گیا کہ یہ لوگ اپنے موقف میں درست نہیں ہیں اور قوم کے ساتھ اسلام کے نام پر دھوکا کر رہے ہیں۔

اخبارات میں غالباً مصلحتاً ان سوالات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ان میں سے ایک سوال ایسا ہے کہ جس کے بارے میں بار بار شریعت بل کے علمبرداروں سے استفسار کیا گیا ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اس سوال کا تعلق قومی اتحاد کے ایک اہم فیصلے سے ہے اس کی تفصیل یوں ہے۔ کہ ۱۹۷۷ء میں انہی علماء نے ملک میں نظام مصطفیٰ کے عملی نفاذ کے لئے قومی اتحاد قائم کیا تھا۔ جس میں جماعت کے علماء شامل تھے ان علماء نے اس وقت قوم کو ایک منشور دیا جس میں دوسرے دعوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اعلان یہ بھی کیا گیا تھا کہ زمین کو بٹائی پر دینے کا معاملہ جسے اصطلاح میں غیر حاضر زمینداری نظام کہتے ہیں، شریعت اسلامی کے خلاف ہے اور قومی اتحاد برسر اقتدار آکر اس غیر اسلامی نظام کو ختم کر کے زمین اسی کاشت کار کے پاس رہنے دے گا جو اس میں عملاً کاشت کریگا۔ غیر حاضر زمینداری نظام کو ختم کرنے کے بارے میں قومی اتحاد کا یہ اعلان اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو سودی لین دین کا معاملہ قرار دیا تھا اور مسلمانوں کو اس معاملے سے منع کر دیا تھا۔ بعد میں چاروں فقہی مذاہب کے بانی ائمہ جن میں حنفی مذہب کے بانی حضرت امام ابو حنیفہ بھی شامل تھے، اسے حرام ہی قرار دیا، اس لئے عامتہ الناس نے قومی اتحاد کے اس

اعلان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

خود قومی اتحاد کے نزدیک اس کے اس فیصلے کی جو اہمیت تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ہل کو اپنا انتخابی نشان قرار دے دیا، جو قومی اتحاد کی تحریک میں شامل ہونے والوں کے لئے ایک یاد دہانی تھی کہ زمین اسی کی ہوگی جو اس میں ہل چلائے گا۔ قومی اتحاد کا یہ منشور تمام قومی اخبارات میں چھپا تھا، اور کسی عالم دین نے اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اجماع امت تھا اور یہ اس انتخابی نشان کے طفیل تھا کہ قومی اتحاد کے لیڈر جہاں بھی جاتے تھے، تو علاقے کے کسان اپنے کندھوں پر ہل اٹھائے ہوئے ان کے استقبال کے لئے موجود ہوتے تھے۔

قومی اتحاد کی تحریک کی کامیابی کے بعد، اس میں شامل دینی جماعتیں شامل اقتدار ہو گئیں۔ لیکن ان دینی جماعتوں نے اپنے مذکورہ بالا اعلان پر عمل کرنا تو کجا، کبھی اس کی طرف بھول کر بھی اشارہ تک نہ کیا۔ کچھ عرصے بعد ان کو حکومت سے چھٹی ہو گئی تو انہوں نے اپنے پرانے اعلان کو بھلا کر دوبارہ غیر حاضر زمینداری نظام کو خالص اسلامی قرار دے دیا۔ قومی اتحاد کی تحریک کی کامیابی کے لئے بہت سے مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اس لئے وہ یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جس معاملے کو ہمارے علماء و مشائخ نے ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کے منشور میں، شریعت اسلامی کے نام سے پیش کیا تھا اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس پر عمل کیوں نہ کیا۔ عمل کرنا تو کجا انہوں نے ۱۹۷۷ء کے بعد شریعت اسلامی کے اس حکم کا کہ جس پر ان سب کا کامل اتفاق تھا، نام تک لینا بھی گوارا نہ کیا۔

عامتہ الناس میں شریعت بل کو مقبول بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ذہن میں ابھرنے والے اس اہم سوال کا انہیں تسلی بخش جواب دیا جائے اس جواب کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نو سال پہلے جب ایک شرعی مسئلہ پر تمام فرقوں کے علماء متفق تھے اور اسے نافذ کرانے کے لئے عوام نے اپنی



جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ لیکن اقتدار ملنے کے بعد ان علماء نے خود اپنے متفقہ فیصلے پر عمل نہ کیا، تو شریعت بل کے بارے میں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ جس کے بارے میں تمام فرقوں کے علماء کا متفق ہونا تو کجا، بعض فرقوں کی جانب سے اس کی سخت مخالفت کی جا رہی اور جیسا کہ ابتدائی سطور میں نقل کیا جا چکا ہے وہ اسے اسلام کے خلاف ایک ڈھونک قرار دیتے ہیں۔

امید ہے کہ شریعت بل کے علمبردار اس اہم مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے بعد اس بارے میں عوام میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ شریعت بل کو مقبول عوام بنانے کے لئے اس اقدام کی سخت ضرورت ہے۔ (نومبر

(۱۹۸۶ء)



## اسلامی نظام کے نام پر جمہوریت کے خاتمے کی جدوجہد مناسب نہیں

ان دنوں جمعیت علمائے اسلام درخواستی گروپ سے تعلق رکھنے والے ایک عالم دین اسلامی نظام کے قیام کے لئے تعاون حاصل کرنے کے لئے پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ دو نکات پر زور دے رہے ہیں ایک یہ کہ جمہوریت کے ہوتے ہوئے، اس ملک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ اہل پاکستان نے ایک عورت کو اپنا حکمران بنا کر اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں نکات کے ذریعے وہ ملک میں گیارہ سال کے بعد قائم ہونے والی جمہوری حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حکومت کے زیر کنٹرول ٹیلی ویژن ان کے اس دورے کی خبریں ٹیلی کاسٹ کر رہا ہے 21 دسمبر 89ء کے خبرنامے میں ان کے فیصل آباد کے جلسے کی توپوری تفصیلات و ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی ہیں۔

جہاں تک جمہوریت کے خلاف حملے کا تعلق ہے تو بہت سے اخبارات نے اپنی انیس اکتوبر کی اشاعتوں میں نوٹس لیا ہے کہ جناب مولانا صاحب اس دین کے

بارے میں یہ دعوے کر رہے ہیں کہ جس نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوریت کا درس دیا تھا۔ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر مولانا صاحب جو خیر سے پاکستان سینٹ کے رکن بھی ہیں۔ دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت خلاف اسلام سے تو انہیں سینٹ کی رکنیت سے استعفاء دے کر اس طریقے کے مطابق جدوجہد کرنی چاہیے جس سے ان کے مطابق اسلامی نظام نافذ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ قرآن مجید نے تو رسول اللہ کو بھی جمہوری طرز عمل اختیار فرمانے کے لئے کہا اور آپ نے اس پر عمل کر کے امت مسلمہ کے لئے ایک بہترین نمونہ بھی چھوڑا تھا۔ امور مملکت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ مسلمان اپنے حکومتی معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ (سورہ الشوریٰ - 42) حکومت کے معاملات کو اس باہمی مشورے سے طے کرنے ہی کو جمہوریت کہتے ہیں۔ رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ کا نبی ہونے کے باوجود کئی مواقع پر اکثریت کی رائے کو اختیار کیا۔ جنگ احد کے موقع پر آپ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن نوجوان صحابہ کی اکثریت نے اس بات پر زور دیا کہ وہ شہر سے باہر نکل کر دشمن سے لڑیں گے۔ اگر چہ بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ کی رائے صائب تھی اور آپ اگر چاہتے تو اپنی رائے پر اصرار کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے تو امت مسلمہ کو جمہوریت کا عملی سبق دینا تھا اس لئے اس کے لئے آپ نے وقتی طور پر نقصان بھی برداشت کر لیا۔

مولوی صاحب کا دوسرا نکتہ عورت کی حکمرانی کو خلاف اسلامی قرار دینا ہے انیس دسمبر 89ء کو جڑانوالہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ عورت کو حکمران بنا کر اہل پاکستان نے اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ قرآن و سنت میں مرد کی حکمرانی کو کہاں اللہ تعالیٰ کے شعائر میں شمار کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں تو حکمرانی کے بارے میں سورہ الشوریٰ میں یہ صرف ایک

اصول بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ یہاں مرد یا عورت کی حکمرانی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اس بارے میں یہ حضرات ایک جھوٹی حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ جو قوم عورت کو حکمران بنائے گی وہ فلاح نہیں پاسکتی اس حدیث کے سب کے سب راوی ائمہ حدیث کے نزدیک غیر ثقہ ہیں دوسرے راویوں کو تو جانے دیجئے اس حدیث کے صحابی راوی، حضرت ابوبکرہ کی چھوٹے چھوٹے معاملات میں گواہی بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی، چہ جائیکہ کہ ان کی روایت کردہ حدیث نبوی کو تسلیم کیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں انہوں نے ایک مقتدر صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ پر زنا کاری کا جھوٹا الزام لگایا تھا الزام ثابت نہ کر سکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر اسی کوڑوں کی شرعی حد نافذ کر دی (تہذیب التہذیب از علامہ ابن حجر عسقلانی جلد دہم ص ۴۶۹) قرآن مجید کی سورہ النور کی چوتھی آیت میں ایسے گناہ کے مرتکب لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کی گواہی کبھی تسلیم نہ کی جائے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات میں ان کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہمارے علماء حضرات اگر ائمہ حدیث کی تحقیق پڑھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے تو وہ صحیح بخاری کی اسی باب یعنی کتاب الفتن میں حضرت ابوبکرہ کی ایک دوسری روایت پر نظر ڈال لیتے تو انہیں ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ اس حدیث کے مطابق وہ جنگ جمل میں شریک ہونے والے ہزاروں صحابہ کرام کو جن میں عشرہ مبشرہ کے لوگ بھی شامل تھے جہنمی قرار دیتا ہے کوئی مسلمان ان کی اس روایت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ (بخاری کتاب الفتن جلد سوم ص ۷۲۹ حاد ابتداء کو ایڈیشن)

مولانا صاحب نے جمہوریت ختم کر کے کس طریقے سے ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جاسکتا ہے، اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ جمہوریت کے مقابل میں ڈکٹیٹر شپ کا نظام ہے اور اس کی بدترین شکل مارشل لاء کی ہوتی ہے۔ عام ڈکٹیٹر کسی نہ کسی

قانون کا چاہے وہ غلط ہو ضرور سہارا لیتا ہے۔ جبکہ مارشل لاء حکام کے منہ سے نکلا ہوا لفظ قانون سمجھا جاتا ہے۔ شاید مولانا صاحب اسی مارشل لاء نظام کو دوبارہ ملک پر مسلط کرنا چاہتے ہیں جمہوریت کی بحالی سے پہلے یہ مارشل لاء نظام ملک پر مسلط رہا ہے۔

علماء حضرات نے اسے خلاف اسلام قرار دینے کی بجائے اسلامی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی ان ہی کی جماعت کے ایک عالم دین نے مارشل لاء کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے یہاں تک فرمایا تھا کہ اسلام میں سب سے پہلا مارشل لاء حضرت ابوبکر نے لگایا تھا۔ مارشل لاء کی حمایت میں فتویٰ جاری کرنے والے علماء کی معلومات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمانوں کی سرے سے کوئی باقاعدہ فوج ہی موجود نہ تھی۔ ضرورت پڑنے پر مسلمان اکٹھے ہو کر دشمن کے خلاف جہاد کرتے تھے۔ اگر جناب مولانا صاحب کو اپنی جماعت کے اس عالم دین کی رائے سے اختلاف ہوتا تو وہ ضرور اس کے خلاف بیان دیتے لیکن کسی عالم دین نے ایسا نہ کیا اور اس طرح انہوں نے عملاً ثابت کیا کہ مارشل لاء خالص اسلامی نظام ہے اب جو ان حضرات نے جمہوریت کے خلاف تحریک چلائی ہے اور اسے خلاف اسلام قرار دیا ہے تو ذہن میں گیارہ سالہ مارشل لاء کا دور سامنے آگیا جسے یہ اسلامی قرار دیتے تھے اور اب جو ملک میں جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے یہ حضرات اسے ختم کر کے ملک میں دوبارہ مارشل لاء کے نفاذ کے خواہش مند ہیں۔

جمہوریت کے خلاف علماء حضرات کی موجودہ تحریک سے بعض اہل علم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لوگ اس طرح جمہوری حکومت کو بلیک میل کر کے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں جنرل ضیاء الحق نے بھی تو ان حضرات کی بلیک میلنگ سے بچنے کے لئے ان کے ساتھ خسروانہ سلوک کیا تھا۔ جس کی بناء پر یہ اس کے اسلامی نظام علمبردار ہونے کے نعرے لگانے لگ گئے تھے۔ بلکہ جن معاملات کو وہ پہلی حکومتوں کے دور میں غیر اسلامی قرار دیتے تھے انہیں جنرل ضیاء الحق کے دور

میں اسلامی تسلیم کر لیا گیا ہمارا اشارہ پاکستان میں عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی کی سلیموں سے ہے علماء حضرات شروع دن سے ان دونوں کی مکالفت کر رہے ہیں یہ دونوں معاملات جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں بھی موجود تھے لیکن ان حضرات نے ان کے خلاف ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ حالانکہ اگر یہ جنرل ضیاء صاحب پر زور دیتے تو وہ ان دونوں معاملات کو قانوناً ختم کر سکتا تھا لیکن نہ ہمارے علماء نے اس بارے میں کوئی مطالبہ کیا اور نہ ہی جنرل ضیاء الحق صاحب نے ایسا کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں معاملات میں ان کی مخالفت کا مقصد سیاسی مفادات حاصل کرنا تھا۔ اب جمہوریت اور عورت کی حکمرانی کی مخالفت کر کے بھی یہ لوگ اسی قسم کے ناجائز فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسلام کو محض ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے تو خود اسلامی جمہوری اتحاد کے ترجمان اخبارات بھی مولوی صاحب جو اس اتحاد کے نائب صدر ہیں کے جمہوریت کے خلاف بیانات کانوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔ (جنوری ۱۹۹۱)



## اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے جدوجہد

جمعیت العلمائے اسلام درخواستی گروپ کے ایک سیاسی مذہبی لیڈر ان دنوں اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں پنجاب کے مختلف علاقوں کا دورہ کر رہے ہیں اور وہ لوگوں سے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مدد کی درخواست کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دو نکات پر زور دے رہے ہیں ایک یہ کہ اہل پاکستان نے ایک عورت کو اپنا حکمران بنا کر، اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا ہے وہ یہ کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں نکات کے ذریعے وہ ملک میں گیارہ سال کے بعد قائم ہونے والی جمہوری حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان ٹیلی ویژن، ان کے اس دورے کی تفصیلات نشر کر رہا ہے۔ مثلاً ۲۱ دسمبر ۸۹ء کے خبرنامہ میں ان کے فیصل آباد کے جلسے کی اچھی خاصی ٹیلی کاسٹ کی گئی ہے۔ جمہوریت کو خلاف اسلام قرار دینے کے بارے میں روزنامہ امروز میں ان کے خیالات کا نوٹس لیا جا چکا ہے اور ان مضامین کو اب کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ جناب سمیع الحق صاحب نے عورت کی حکمرانی کو شعائر اسلام سے مذاق قرار دیا ہے تو ہمیں دکھ ہوا کہ ان صاحب کو نہ صرف یہ کہ عورت کی حکمرانی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا علم نہیں، بلکہ شعائر اسلام کے مفہوم سے بھی نااہل ہیں۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی

مرد کی حکمرانی کو شعارِ اسلام میں سے شمار نہیں کیا گیا۔ یہ حضرات حکومت کی مخالفت میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ خود شعارِ اسلام کے مفہوم کی من مانی تفسیر کر کے، ان کی توہین کر رہے ہیں۔

ہمارے علماء حضرات، اسلامی نظام کے لیے خود کچھ کرنے کی بجائے صرف نعروں یا حکومت سے مطالبات پر اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی نظام کی لاج رکھنے کے لیے حرام کی آمدنی سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ انہیں جناب سمیع الحق صاحب کا ایک دینی ماہنامہ 'الحق' کے نام سے شائع ہوتا ہے جس میں سگریٹ نوشی کی ترغیب کے لیے سگریٹ کمپنیوں کے اشتہارات لگاتار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سگریٹ نوشی چونکہ حرام ہے اور جب اس کا ظہور اسلامی دنیا میں ہوا تو اسلامی ممالک کے علماء نے اسے حرام قرار دیا تھا۔ راقم نے ان علماء کے فتاویٰ کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کروا دیا تھا، دوسرے دینی رسالوں کے علاوہ راقم نے یہ پمفلٹ ماہنامہ 'الحق' کے ایڈیٹر صاحب کو ارسال کیا تھا کہ وہ ان فتاویٰ کو اپنے رسالے میں شائع بھی کر دیں اور سگریٹ کمپنیوں کے اشتہارات سے بھی اپنے آپ کو بچائیں کہ ایک حرام معاملے کی تشہیر سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ بھی حرام ہوتی ہے اس پمفلٹ کے ساتھ راقم نے انہیں عورت کی حکمرانی کے بارے میں اپنی کتاب منصب حکومت اور مسلمان عورت کا اشتہار بھی ارسال کیا۔ ویسے یہ اشتہار تمام اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ راقم نے انہیں بتایا کہ جس حدیث کے حوالے سے مولوی حضرات عورت کی حکمرانی کو ناجائز قرار دے رہے ہیں وہ خود علمائے حدیث کے نزدیک جھوٹی ہے کیونکہ اس کے تمام کے تمام راوی 'آئمہ حدیث کے نزدیک غیر معتبر ہیں۔ ان سے درخواست کی گئی تھی کہ اگر وہ عورت کی حکمرانی کے بارے میں اسلام کا صحیح نقطہ، نظر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

معلوم نہیں انہوں نے میری کتاب کا مطالعہ کیا یا نہیں لیکن تمباکو نوشی کے



بارت میں ارسال کردہ فتاویٰ کے بارے میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ نہ تو انہوں نے سگریٹ نوشی کے حرام ہونے کے بارے میں اپنے سلف صالحین کے فتاویٰ شائع کئے اور نہ ہی سگریٹ نوشی کی ترغیب دلانے والے اشتہارات کی اشاعت روکی۔ جو حضرات تھوڑے سے مالی فائدے کے لیے اور وہ مالی فائدہ بھی حرام آمدنی پر مشتمل ہے، کو چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اسلامی نظام کے قیام کے دعوے کس منہ سے کرتے ہیں:-

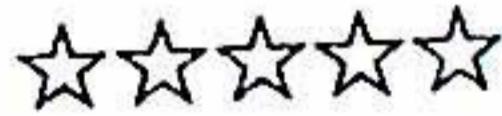
اصل میں یہ حضرات قیام پاکستان سے لے کر اب تک اسلام کے بارے میں عجیب طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت، مختلف شرعی مسائل کے بارے میں ان کے متضاد طرز عمل سے ملتا ہے، صدر ایوب کے زمانے میں ملک میں عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان حضرات نے شور مچانا شروع کیا کہ یہ قوانین شریعت اسلامی کے خلاف ہیں۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ جب یہی قوانین ۱۹۴۹ء میں مصر میں نافذ ہوئے تھے تو برصغیر کے تمام علماء نے ان کی تعریف کی تھی لیکن صدر ایوب کے دور میں علماء حضرات نے ان قوانین کے خلاف اور خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف بھرپور تحریک چلائے رکھی لیکن ان کے بعد کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس تحریک میں بھی مخلص نہیں تھے بلکہ صرف سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

تفصیلی اس اجمال کو یہ ہے کہ یہی عائلی قوانین جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی نافذ رہے ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر تو صدر ایوب کے دور سے بھی زیادہ تیزی سے عمل ہونے لگا، بلکہ اس مقصد کے لیے اسلامی جمہوری اتحاد کی ایک لیڈر عورت کو خاندانی منصوبہ بندی کا وزیر بنا دیا گیا۔ عوام حیران تھے کہ صدر ایوب کے زمانے میں علماء حضرات کی ہر تقریر کا موضوع عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی ہوتے تھے۔ اب یہ اچانک خاموش کیسے ہو گئے بعد میں جب بنکوں سے زکوٰۃ کے نام پر سود کی رقم اکٹھی کر کے مولوی حضرات کی جیبوں میں



لئے صرف نعروں اور حکومت سے مطالبات تک اپنے آپ کو محدود نہ کرتے بلکہ موجودہ معاشرے کو اسلامی بنانے کے لئے جدوجہد کرتے، لیکن جو حضرات اپنے مالی فائدے کے لئے سگریٹ نوشی کی ترغیب دینے والے اشتہارات کی حرام آمدنی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، وہ اس ملک میں اسلامی نظام کے لئے کیا قربانی دے سکتے ہیں۔

پاکستان قومی اتحاد کے قیام کے وقت ان کے لیڈر مفتی محمود صاحب نے اعلان کیا تھا کہ غیر حاضر زمینداری نظام حرام سے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس اعلان کو قومی اتحاد کے منشور کے ایک حصے کے طور پر پیش کیا لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی جماعت کے کسی مولوی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ ان کے اعلان کردہ فیصلے مطابق غیر حاضر زمینداری کے خلاف تحریک چلاتے، غیر حاضر زمینداری کو خود رسول اللہ صلعم نے سودی معاملہ قرار دیا تھا۔ ان کے لیڈر نے بھی حضور کے اسی ارشاد کے حوالے سے اسے حرام قرار دیتے تھے لیکن اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والے اپنے مالی مفادات کیلئے اس سودی معاملے کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس طرح اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا راستہ روکتے ہیں اور پھر دعوے کرتے ہیں کہ وہ اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۸۹ء)

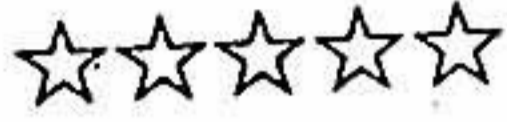


عام عدالتیں تو اپنے فیصلوں پر عمل کروا لیتی ہیں اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو اسے توہین عدالت کے جرم میں دھریا جاتا ہے لیکن شرعی عدالت کے فیصلوں پر عمل نہ کیا جائے تو ایسی کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ مثلاً وفاقی شرعی عدالت نے چار پانچ سال پہلے گھوڑ دوڑ کے کاروبار کو غیر اسلامی اور حرام قرار دیا تھا لیکن اس کے باوجود کسی نے اس کاروبار کو بند نہ کیا بلکہ یہ دن بدن ترقی پذیر ہے ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ء کے اخبارات میں ایک سروے شائع ہوا ہے جس کے مطابق ملک عزیز میں گھوڑ دوڑ پر ہر ماہ چالیس کروڑ روپے کا جواء کھیلا جاتا ہے حیرت کی بات ہے کہ وفاقی شرعی عدالت اس کاروبار کو ناجائز اور حرام قرار دے چکی ہے لیکن یہ کاروبار پوری شان سے جاری ہے سنا ہے کہ علماء حضرات نے گھوڑ دوڑ پر جوئے کو شرعاً جائز قرار دینے کے فتوے دے دیئے ہیں اس لئے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر عمل نہیں ہو رہا۔ معلوم نہیں کہ کون سے اسلام کے تحت ان علماء حضرات نے جوئے کے فتوے دیئے ہیں لیکن اس حرام کاروبار پر ان کی خاموشی سے یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت کو اپنا اسلامی تشخص قائم کرنے کے لئے اس بارے میں کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہو گا تاکہ عوام کو یہ یقین ہو سکے کہ وہ جو فیصلہ دیتی ہے۔ اس پر عمل بھی کرا سکتی ہے۔

راقم کے خیال کے مطابق ہمارے ملک کی تمام عدالت ہائے عالیہ کے کام کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ یہ سب عدالتیں اسلامی معاملات کے بارے میں مقدمات کی سماعت کرتی رہتی ہیں تو اس صورت میں ان میں سے ایک عدالت کو شرعی عدالت کا نام دینا اور باقی کو پرانے نام سے باقی رکھنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے غلط کار قسم کے لوگوں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ ان عدالتوں کے اسلامی قانون کے مطابق فیصلوں میں بھی کیڑے نکالیں جیسا کہ جمہوریت کے قیام کے سلسلے میں ان عدالتوں کے فیصلوں کے بارے میں غلط پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ملک کی تمام عدالتوں کو ایک ہی نام سے پکارا جائے۔

جب عدالتیں مقدمات کے فیصلے ایک ہی اصول کے تحت کرتی ہیں تو ان میں شرعی اور غیر شرعی کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس تفریق سے خواہ مخواہ عدالت ہائے عالیہ کے اسلامی تشخص کو مجروح کیا جا رہا ہے اس غلط طرز عمل کو ختم کرنے کیلئے فوری اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ (جولائی ۱۹۸۸ء)



## شرعی عدالت کا دائرہ کار

صدر پاکستان نے حال ہی میں جن دستوری ترمیمات کا اعلان کیا ہے ملک عزیز میں ان پر گرما گرم بحث شروع ہو چکی ہے ہمارے ریٹائرڈ جج صاحبان نے قوم کی رہنمائی کے لئے ان دستوری ترمیمات کی وضاحت میں جو دل چسپی لی ہے وہ قابل قدر ہے کچھ جج صاحبان نے تو ان ترمیموں پر طرح طرح کے اعتراض اٹھائے ہیں۔ جب کہ بعض نے ملک کی دستوری تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا دفاع کیا ہے۔ بحث کی اس گرم جوشی میں ان حضرات نے ایک اہم ترمیم کی طرح پوری طرح دھیان نہیں دیا۔ حالانکہ یہ ترمیم اپنی اہمیت کے لحاظ سے خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ معاشرے کو اسلامی بنانے کی طرف یہ ایک اہم قدم ہے بلکہ اس کی روشنی میں وہ تمام بنیادی حقوق بھی بحال ہو جائیں گے جو اسلام نے انسانوں کو عطا کئے ہیں۔ یہ ترمیم قرارداد مقاصد کو آئین کا اہم حصہ بنانے سے تعلق رکھتی ہے۔

قومی اخبارات کے ایڈیٹروں کے پینل جس نے آئینی ترمیم پر عملدرآمد کے سلسلے میں صدر کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ان کا انٹرویو لیا تھا، نے ان سے یہ اہم سوال کیا تھا کہ آئین میں جو بنیادی حقوق اہل پاکستان کو دیئے گئے ہیں کیا ان کے

بارے میں عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ صدر صاحب نے اس سوال کا جواب دیا جو خود ان کے الفاظ میں کچھ یوں ہے۔

اب جب کہ قرار داد مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا ہے جو اس قرار داد میں جن حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ان کے بارے میں عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے عام انسانی حقوق کی ضمانت آئین کے پہلے حصہ میں دی گئی ہے اور ان کے ساتھ اہل پاکستان کو وہ اسلامی حقوق بھی حاصل ہوں گے جن کی قرار داد مقاصد میں تشریح کی گئی ہے ان دونوں قسم کے بنیادی حقوق کے بارے میں عدالتوں سے رجوع کیا جاسکے گا۔ مختصر یہ کہ وہ آزادیاں اور حقوق دنیاوی انسانی حقوق سے بھی متمتع ہو سکیں گے۔ (روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۵ مارچ صفحہ نمبر ۱)

بنیادی اسلامی حقوق کے بارے میں صدر پاکستان کی یہ وضاحت بڑی قابل غور ہے لیکن جس غور کی یہ مستحق تھی اس طرف مناسب دھیان نہیں دیا گیا۔ ممکن ہے کہ جو لوگ آئینی ترمیمات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں وہ ان کی مخالفت میں مخلص ہوں ان کی مخالفت کی اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورت حال کا تقاضا ہے کہ اس بارے میں اختلاف رکھنے والے اپنے اختلافات کا فیصلہ قرآن حکیم اور سنت رسول کی روشنی میں کریں۔ اس بارے میں قرآن حکیم میں بڑی واضح ہدایات موجود ہیں جو اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات کا فیصلہ مندرجہ ذیل طریقے سے کریں۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور جو تم میں سے صاحب اختیار ہوں ان کی تابعداری کرو اور اگر کسی معاملہ کے بارے میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ طریقہ اچھا ہے اور مقصد حاصل کرنے کے لئے مفید ہے (سورہ النساء آیت ۵۹)

اس آیت مبارکہ میں نظام مملکت چلانے کے بارے میں راہنمائی کے اہم

قوانین کی وضاحت کی گئی ہے کہ ان میں پہلا مرحلہ احکام الہی کی اور سنت رسول کی اطاعت ہے دوسرے مرحلے میں ریاست کے حکمرانوں کی اطاعت ہے۔ لیکن اگر ان حکمرانوں کے ساتھ کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو ختم کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قرآنی حکیم کی ایک سے زیادہ مرتبہ تشریح فرمائی ہے آپ نے فرمایا کہ مسلمان حکمرانوں کی بات سننا اور اس پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے بشرطیکہ وہ کوئی خلاف اسلام حکم نہ دیں۔ لیکن اگر وہ کوئی خلاف اسلام حکم سنوانا چاہیں تو کسی مسلمان کو نہ تو ان کی ایسی بات سننی چاہیے۔ اور یہی اس پر عمل کرنا چاہیے۔

(صحیح بخاری کتاب الجہاد بارہ جلد دوم صفحہ ۱۳ احمد اینڈ کمپنی ایڈیشن) ایسی ہی ایک حدیث صحیح بخاری کی کتاب الاحکام جلد سوم صفحہ ۷۳۳ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

ان اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر کسی موقع پر دینی معاملات کے بارے میں حکمرانوں اور رعیت کے درمیان کسی معاملے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو قاضی (اسلامی جج) سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنا فیصلہ دے۔ یہ ادارہ ہمارے پاس پہلے ہی شریعت عدالت کی شکل میں موجود ہے۔ اس وقت اس عدالت کا دائرہ کار کچھ محدود ہے اور وہ کچھ مسائل مثلاً سود اور عاکلی قوانین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتی۔ یہ پابندی اس کے آزادی سے کام کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اب جب کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا ہے تو اس میں جن اسلامی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ان کے بارے میں عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ شریعت کورٹ کے دائرہ کار پر جو پابندیاں ہیں انہیں فی الفور ختم کر دیا جائے اسے اس امر کی مکمل آزادی ہو کہ اس کے پاس جو بھی معاملہ لایا جائے وہ اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ صادر کر سکے اس اقدام سے ہر قسم کے اعتراضات کا احسن طریقے سے ختم کیا جاسکتا ہے۔



پاکستانی معاشرے سے سود ختم کرنے کے لئے حکومت نے جو عمل اقدام اٹھائے ہیں ان کے نتیجے میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ شریعت کورٹ کا دائرہ اختیار مالی معاملات تک بھی بڑھا دیا جائے۔ جہاں تک عائلی قوانین کا تعلق ہے ان کے بارے میں عرض ہے کہ ان کی مخالفت کی وجہ بھی زیادہ تر سیاسی تھی۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان قوانین کی مخالفت بھرپور انداز سے کی جا رہی تھی تو راقم نے ان عائلی قوانین کا تقابلی مطالعہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین سے کیا اور یہ ثابت کیا کہ ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے وہ سرچشمہ مصر کے عائلی قوانین تھے جو آج سے پچاس سال پہلے اس ملک میں نافذ ہو چکے تھے پاکستان میں عائلی قوانین ان مصری قوانین کا انگریزی ترجمہ معلوم ہوتے تھے جب کہ مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین ان کا اردو ادبی ایڈیشن تھا اس سے عائلی قوانین کی مخالفت کا زور کم ہو گیا راقم ایک دفعہ پھر یہ اعلان کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے کہ ان قوانین میں ایک شق بھی غیر اسلامی نہیں زیادہ سے زیادہ ان کی زبان کو بہتر بنانے کی گنجائش نکلتی ہے شریعت کورٹ میں ان کا بڑی عمدگی سے دفاع کیا جاسکتا ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ گزارش بے جا نہ ہوگی کہ شریعت کورٹ کے دائرہ کار کو تمام اسلامی امور تک بڑھا دیا جائے کسی فرد یا جماعت کو کسی قانون کے اسلامی ہونے کے بارے میں اگر کوئی اعتراض ہو تو وہ اس کی وضاحت کے لئے شریعت کورٹ میں جانے کے لئے پوری طرح آزاد ہو۔ اس اقدام کا یہ مثبت نتیجہ نکلے گا کہ جن حضرات کی جانب سے آئینی ترمیمات پر طرح طرح کے اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ ان کی وضاحت کے لئے وہ شریعت کورٹ کا دروازہ کھٹکانے پر مجبور ہوں گے۔ امید ہے شریعت کورٹ اختلاف رکھنے والی پارٹیوں کے لئے ایک عمدہ فورم ثابت ہوگا۔ جس کے ذریعے اختلافات کو ختم کر کے قومی اتحاد کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ (مارچ ۱۹۸۵ء)



## عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی نعیمی صاحب نے ۱۲ مارچ کو ایک عدالت میں بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ اسلام میں عدالت کے فیصلے کے بغیر بھی دو جھگڑنے والی پارٹیاں ایک دوسرے کو سزا دے سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ مثال بیان کی کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو قابل اعتراض حالت میں پائے توہ اسے قتل کر سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ بیان انتظامیہ کے ایک غلط اقدام کے لئے اسلامی جواز مہیا کرنے کے لئے دیا ہے۔ (روزنامہ مساوات بابت ۱۳ مارچ ۱۹۹۱ء) مفتی صاحب کے اس بیان کو ایک ہفتے کا عرصہ گزر چکا ہے ان کا یہ بیان تمام قومی اخبارات میں شائع ہوا تھا لیکن ابھی تک کسی عالم دین نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی شریعت اسلامی کا اس بارے میں یہی حکم ہے تاہم مفتی صاحب نے اپنے اس بیان کی تائید میں کسی اسلامی حکم یا قانون کا حوالہ نہیں دیا اور وہ دے بھی کیسے سکتے تھے۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی قانون شریعت اسلامی میں موجود نہیں۔

اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اس تلخ حقیقت کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہمارے علماء حضرات نے اسلام کے بارے میں عجیب رویہ اختیار کر رکھا ہے

وہ قیام پاکستان سے لیکر اب تک ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن اس کے قیام میں وہی سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں حکمران طبقہ بھی اس حقیقت سے خوب واقف ہے اس لئے وہ وقتاً فوقتاً اس مقصد کے لئے ان کی خدمات حاصل کرتا رہتا ہے۔ ایک طرف وہ عوام میں اپنی مقبولیت کے لئے اسلامی نظام کے سلسلے میں ایک قدم اٹھاتا ہے تو دوسری طرف سے علماء حضرات کی جانب سے اس اقدام کی مخالفت شروع کرا دیتا ہے اور اس طرح وہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے اسلام کا نام استعمال کرتا رہتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ملک کے ۳۱ سرکردہ علماء کا ایک کنونشن ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن میں علماء حضرات نے وہ اصول طے کئے جو ان کے خیال کے مطابق اسلامی نظام کی بنیادیں ہیں ان اصولوں کی تعداد پوری بائیس تھی اور بعد میں یہ علماء کے بائیس نکات کے نام سے مشہور ہوئے ان میں انیسواں اصول اسلام کے نظام عدل کے بارے میں تھا اور اس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دے۔ اس سلسلے میں جو پریس کانفرنس منعقد کی گئی تھی اس میں بتایا گیا تھا کہ انتظامیہ کس طرح عوام پر ظلم کرتی رہتی ہے۔ اور اس کی خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ خود ہی انصاف کرنے والی ہوتی ہے اس لئے یہ طریق کار اسلام تعلیمات کے خلاف ہے جسے فوری طور پر بدلا جائے۔ اس کے بعد جب ہی مولوی حضرات کو انتظامیہ کی جانب سے کچھ تکلیف پہنچتی تو وہ اس مطالبے کو دھراتے۔ خود عوام بھی کئی سالوں سے حکومت سے یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں چنانچہ اس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے ۱۹۸۹ء میں کچھ عملی اقدامات اٹھائے اور عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کرنے کے لئے ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کر دی۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت کے قیام سے پہلے اس کمیٹی کی کارروائی کے بارے میں خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن اب کچھ عرصے سے یہ خبریں نظر

سے نہیں گزریں۔ اب جو موجودہ حکومت کے اہم سرکاری مولوی مفتی نعیمی صاحب کا بیان نظر سے گذرا تو اس تاخیر کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

مفتی صاحب نے اپنے اس بیان میں انتظامیہ کو عدلیہ کے فیصلے کے بغیر سزا دینے کا جو حق دیا ہے تو اسلامی تعلیمات سے اس کی تائید نہیں ہوتی اس کی وضاحت ایک مثال سے ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عرب کے ایک عیسائی بادشاہ جبکہ بن اہم نے اسلام قبول کر لیا تھا حج کے دوران وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا تو اس کی چادر پر ایک عربی بدو کا پاؤں پڑ گیا جس سے جبکہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اس عربی کو تھپڑ رسید کر دیا۔ مفتی صاحب نے اسلام کے عدالتی نظام کو جو تشریح کی ہے اس کی رو سے تو جبکہ حق بجانب تھا لیکن اسلامی تعلیمات میں اس کی اس زیادتی کی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبکہ سے اس عربی کو بدلہ دلوانے کا حکم دیا۔ جبکہ نے اس فیصلے پر اعتراض کیا کہ وہ ایک بہت بڑا بادشاہ ہے اور ایک بازاری کو اس سے بدلہ دلوایا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلام نے ان دونوں کے درمیان برابری قائم کر دی ہے اس لئے جو بھی جرم کریگا اسے اس کے مطابق سزا دی جائے گی۔ مختصر یہ کہ اسلام کے نظام عدل کا یہ بنیادی ستون ہے کہ قانون کی نظر میں تمام افراد معاشرہ برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں جو بھی جرم کریگا وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ لیکن برصغیر میں ہمارے علماء نے جاگیرداروں کے تحفظ کے لئے اس کے خلاف ایک خلاف اسلام فتویٰ دیا تھا جس کے حوالے سے اب مفتی نعیمی صاحب انتظامیہ کو لوگوں پر تشدد کرنے کی کھلی چھٹی دے رہے ہیں۔

اس فتویٰ کی شان نزول یہ تھی کہ انگریزوں نے اس ملک میں جاگیردارانہ نظام قائم کیا۔ خیال رہے کہ شریعت اسلامی کے مطابق اسلامی ریاست میں زمین کی خرید و فروخت کی اجازت نہیں انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے یہاں پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور اسی اسلامی قانون پر عمل ہوتا تھا یعنی یہاں سر زمین کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی ہر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا

سکتا تھا۔ انگریزوں نے ۱۷۹۳ء میں بنگال کے بندوبست دوائی کے ذریعے یہاں بڑے بڑے زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کیا اور زمین کی خرید و فروخت کی اجازت دی۔ یہ بڑے بڑے زمیندار انگریزی حکومت کا غلبہ قائم رکھنے کے لئے اپنے علاقوں کے غریب عوام پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ اور اگر کسی نے مقابلہ کرنے کی جرات کی تو اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے قتل کو جائز قرار دینے کے لئے انہوں نے مولوی حضرات کی خدمات حاصل کیں انہوں نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی قاتل غیرت کی بنا پر کسی کو قتل کر دے تو اسلام میں اس کی اجازت ہے ان حضرات نے یہ نہ سوچا کہ بے غیرتی کی وجہ سے کون قتل کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی یہ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار اپنے کسی دشمن کو ٹھکانے لگاتے تھے اور بد قسمتی سے ابھی تک یہ کھیل جاری ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا کہ صاحب موصوف نے اسے اپنے خاندان کی کسی عورت کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پایا تھا۔ بعض اوقات تو قتل کے اس جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اپنے خاندان کی کسی معصوم عورت کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا اور اس طرح اپنی غیرت کا ثبوت دیا جاتا تھا۔ اول تو علماء حضرات کے تعاون سے ایسے قتل کا دیت کی ادائیگی کے ذریعے فیصلہ کر لیا جاتا اور اگر عدالت میں بھی مقدمہ جاتا تو عدالت علماء حضرات کے اس فتویٰ کی روشنی میں نرمی سے کام لیتی۔ لیکن اسلامی قانون میں ایسے قتل کی کوئی گنجائش نہیں ایسا قاتل بھی دوسرے قاتلوں کی طرح سخت سزا کا مستحق ہے لیکن اگر مفتی نعیمی صاحب جیسے لوگوں کی بات مان لی جائے تو پھر کسی بھی قاتل کو سزا نہ دی جاسکے گی۔ کیونکہ ہر قاتل یہی دلیل دے گا کہ اس نے مقتول کو اپنے خاندان کی کسی عورت کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پایا تھا جسے اس کی غیرت برداشت نہ کر سکی۔ وہ ان جاگیرداروں کی طرح اپنی جان بچانے کے لئے خاندان کی کسی معصوم عورت کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ اس سے ملک میں جو طوائف الملو کی پھیلے گی اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مفتی نعیمی اور ان جیسے دوسرے مفتیوں کو اس امر کا احساس کرنا

چاہیے کہ وہ تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لئے کیا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں اور اسلام کو حکمرانوں کی لونڈی بنانے کے لئے ایسے فتوے دے رہے ہیں جن سے اسلام کے نظام عدل کی جڑ کٹ سکتی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں علماء حضرات سے درخواست ہے کہ ان کے بزرگوں نے چالیس سال پہلے انتظامیہ کو عدلیہ سے الگ کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا وہ اس پر قائم رہتے ہوئے حکومت سے اس بارے میں عملی اقدامات اٹھانے کا مطالبہ کریں۔ مفتی نعیمی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج انہیں حکومت کی جو سرپرستی حاصل ہے وہ کوئی دیرپا چیز نہیں ہوتی۔ خود کسی وقت میں انہیں بھی انتظامیہ کے مظالم کا شکار ہونا پڑے گا۔ اس وقت وہ افسوس کریں گے کہ انہوں نے اسلام کو انتظامیہ کی لونڈی بنانے کا جو فتویٰ دیا تھا اب کس طرح وہ خود ان کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔



## آئین میں آٹھویں ترمیم کی اسلامی دفعات کا جائزہ

ان دنوں قومی اخبارات میں آئین میں آٹھویں ترمیم کے ختم کرنے اور اسے باقی رکھنے کے بارے میں زوردار بحث چھڑی ہوئی ہے اس بارے میں حکومت پاکستان کا موقف یہ ہے کہ اس ترمیم کے ذریعے ۱۹۷۳ء کے دستور کی جمہوری روح کو کچل دیا گیا ہے اس لئے وہ اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے ان کے مقابلے میں حزب اختلاف کے لیڈر جو کل تک اس ترمیم کے مخالف تھے۔ اب اسے باقی رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کچھ سیاسی مذہبی لیڈروں نے اس بناء پر اس ترمیم کے خاتمے کی مخالفت کی ہے کہ اس کے خاتمہ سے پچھلے دور حکومت میں اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت ختم ہو جائے گی۔ آئندہ سطور میں ان حضرات کے اس نقطہ نظر کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان اسلامی تعلیمات کی تفصیل پیش کی جائے جو آٹھویں ترمیم کے حوالے سے دستور میں شامل کی گئی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

- ۱۔ پاکستان کی پارلیمنٹ کا نام، مجلس شوریٰ رکھ دیا گیا ہے۔
- ۲۔ قرار داد مقاصد، جو پہلے آئین کے افتتاح کی حیثیت رکھتی تھی اب

اسے آئین کا مستقل حصہ بنا دیا گیا ہے۔

۳۔ عشر کی وصولی کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۵۔ اقلیتوں کا انتخاب مخلوط طریقہ انتخاب کی بجائے، جداگانہ طریقہ

انتخاب سے عمل میں لایا جائے گا۔

۶۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے اراکین کی اہلیت میں مندرجہ ذیل تین

شقوق میں اضافہ کیا گیا ہے۔

د۔ امیدوار اچھے اخلاق کا مالک ہو اور اسلامی احکامات کی مخالفت کے لئے

مشہور نہ ہو۔

ه۔ اسے اسلامی تعلیمات اور خاص کر اسلامی فرائض کا مناسب علم ہو اور

وہ گناہ کبیرہ سے اپنے آپ کو بچاتا ہو۔

و۔ وہ نیک، پاکیزہ، دیانتدار اور امانتدار ہونا چاہیے۔ ان دفعات پر آئندہ

سطور میں بحث کی جاتی ہے۔

آٹھویں ترمیم کی پہلی شق، پارلیمنٹ کے اسلامی نام کے بارے میں ہے کہ

آئندہ سے اسے پارلیمنٹ کی بجائے، مجلس شوریٰ کہا جائے گا صرف نام کے بدلنے

سے کوئی حقیقی فرق پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ ہم صدق دل سے اسلامی نظام کے

لئے کوشش نہ کریں۔ کسی غیر مسلم کا اسلامی نام رکھ دینے سے وہ مسلمان نہیں ہو

جاتا۔ اسلامی نظام کے بارے میں ہمارے طرز عمل کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا

ہے کہ جس دور میں پارلیمنٹ کا یہ اسلامی نام رکھا گیا معاشرے کو اسلامی بنانے کے

لئے کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا گیا حالانکہ یہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بنیادی شرط

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جو شرعی حدود نافذ کی گئیں۔ ان کا مثبت نتیجہ نہ نکل

سکا بلکہ اس کے برعکس سود جیسے حرام معاملے کو جائز قرار دے کر، معاشرے پر سرمایہ

داری نظام کی گرفت کو مزید مضبوط کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اب اسے ایک اسلامی



معاشرے میں تبدیل کرنا قریباً ناممکن ہو چکا۔ قارئین جانتے ہیں کہ اس دور میں ہماری اس اسلامی مجلس شوریٰ نے آٹھویں ترمیم کو تو ایک دو دن میں منظور کر لیا تھا جبکہ شریعت بل پر تین چار سال کی بحث کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔

آٹھویں ترمیم میں اسلامی نظام کے سلسلے میں جس اہم شق کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ”عشر کی وصولی کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ حالانکہ پاکستان میں اسلامی قانون کے مطابق سرے سے عشر نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی اراضی اسلامی قانون کے مطابق ”خراجی“ کہلاتی ہیں جن پر عشر نافذ ہی نہیں ہوتا یہ اراضی اسلامی ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں لیکن اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہاں پر عشر نافذ کیا گیا تاکہ غیر حاضر زمینداروں کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ اس مسئلہ کی تفصیلات کئی مرتبہ امروز کے صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں اگلی شق قرار داد مقاصد کے بارے میں ہے کہ پہلے اس کی حیثیت آئین کے دیباچے کی تھی، اب اسے آئین کا مستقل حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اس بارے میں دلیل یہ دی گئی ہے کہ آئین کے دیباچے کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو اصل آئین کو ہوتی ہے بلکہ اگر کسی مسئلہ پر دیباچہ اور آئین کی کسی شق میں اختلاف ہو تو آئین کی اصل عبارت کو ترجیح دی جاتی ہے اس دلیل میں ضرور وزن ہوتا اگر خود آئین میں اس کی اسلامی حیثیت کی وضاحت نہ ہوتی جبکہ آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۲ میں یہ واضح اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا اور یہاں پر کوئی قانون، قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ اس لیے اگر قرار داد دیباچہ کے طور پر رہے یا اسے آئین میں شامل کر دیا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آٹھویں ترمیم کی اگلی شق اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبروں میں اضافے کے بارے میں حقیقتاً یہ ایک انتظامی معاملہ ہے اور ہر حکومت اپنے وقت کے حالات کے مطابق اس کونسل کے اراکین کی تعداد میں اضافہ یا کمی کر سکتی ہے۔ ویسے اس شق سے کچھ لوگوں کو نوازنے کی کوشش کی گئی لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کی کارکردگی



نہیں لیکن ان ملکوں میں کبھی کوئی غلط یا بد معاش قسم کا امیدوار کامیاب نہیں ہو سکا۔ دور کیوں جائے ابھی حال ہی میں امریکہ کے ایک نائب صدر کو اپنے عہدے سے اس لیے ہاتھ دھونے پڑے کہ اس نے اپنی زائد آمدنی کے بارے میں انکم ٹیکس کا گوشوارہ جمع نہیں کرایا تھا جب کہ ہمارے ملک میں صدر پاکستان کہ جس کی ایماء پر یہ اسلامی دفعات آئین میں شامل کی گئیں، نے قومی اسمبلی کے ممبروں کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے کہ وہ اپنے انتخابی اخراجات کے صحیح گوشوارے پیش نہیں کریں گے، انہیں سرے سے گوشوارے پیش کرنے سے ہی مستثنیٰ کر دیا۔

مختصراً یہ کہ آٹھویں ترمیم کی منسوخی سے، معاشرے کو اسلامی بنانے کا کام کسی طرح متاثر نہیں ہوگا۔ جب حکومت اور حزب اختلاف کے لیڈروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس ترمیم سے ۱۹۷۳ء کے آئین کی جمہوری روح ختم ہو چکی ہے تو پھر اسے ضرور ختم ہونا چاہیے اسلام کے نام پر اس غیر اسلامی ترمیم کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک معاشرے کو اسلامی بنانے کا تعلق ہے اس کے لئے آئین کا آرٹیکل نمبر ۲ کافی واضح ہے۔ بشرطیکہ ہم دیانت داری سے اس مقصد کے لیے کام کریں، جب کہ پچھلے دور حکومت میں ایسے اقدامات اٹھائے گئے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے، ان میں سود کو جائز قرار دینے کی طرف سطور سابقہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کے کسی علمبردار نے اسلامی قانون کی اس خلاف ورزی کے خلاف انگلی تک نہ اٹھائی بلکہ اس کی تائید میں فتاویٰ جاری کر دیے۔ دراصل یہ غلط فتاویٰ جاری کرنے والے علماء ہی تو اسلامی نظام کے نفاذ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ (فروری ۱۹۸۹ء)



## شریعت اسلامی اور عوام کو درپیش معاشی مسائل!

شریعت بل کے حق میں ان دنوں جو تحریک چلائی جا رہی ہے اس کے بارے میں عوام نے جس بے حسی کا ثبوت دیا ہے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس مقصد کے لئے بڑے سے بڑے جلوس میں اتنے آدمی اکٹھے نہ کئے جاسکے جتنے کہ پارلیمنٹ میں شریعت بل کے علمبرداروں کی تعداد ہے۔ دوسری طرف انہی دنوں قوم کو ایک معاشی مسئلہ درپیش آیا تو وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہمارا اشارہ اس سال کے قومی بجٹ کی طرف ہے کہ جس میں لگائے گئے ٹیکسوں کے خلاف عوام نے ملک گیر مہم شروع کر دی۔ یہاں تک کہ حکومت کو یہ ٹیکس واپس لینے پڑے اور حیرت کی بات ہے کہ اس مہم کے لئے انہیں کسی سیاسی لیڈر نے نہیں اکسایا تھا جبکہ شریعت بل کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی لیڈر چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ان دونوں واقعات کے بارے میں عوام کے رد عمل کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں اصل طاقت معاشی حقائق ہیں اور کوئی بھی تحریک ان سے چشم پوشی کر کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ماضی قریب میں ملک میں کامیاب ہونیوالی سیاسی تحریکوں کی کامیابی کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی یہ کامیابی معاشی

حقائق کے صحیح ادراک کا نتیجہ تھی مثلاً پیپلز پارٹی نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات، اپنے انقلابی معاشی پروگرام کی بنا پر جیتے تھے لیکن جب اس پارٹی کی حکومت نے اپنے اعلان کردہ معاشی پروگراموں کو عملی جامہ نہ پہنایا تو عوام اس سے بددل ہو گئے۔ چنانچہ دوسری سیاسی پارٹیوں نے عوام کی اس بددلی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک نیا معاشی پروگرام پیش کیا۔ اس مقصد کے لئے حزب اختلاف کی جماعتوں نے جو سیاسی محاذ یعنی قومی اتحاد، قائم کیا تو اس نے ملک کے عوام کی اکثریت کو درپیش معاشی مسئلہ کو اولیت دی۔ چنانچہ اس نے اپنے انتخابی منشور میں یہ اعلان کیا کہ قومی اتحاد برسر اقتدار آکر غیر حاضر زمینداری کا نظام ختم کر دے گا اور زمین اسی کاشت کار کے پاس رہنے دی جائے گی جو عملاً اس پر کام کرے گا۔ قومی اتحاد نے اپنے اس معاشی پروگرام کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ اس نے اپنے انتخابی نشان کے لئے ”ہل“ کا انتخاب کیا جو اس بات کی علامت تھا کہ زمین اسی کی ہوگی جو اس میں ہل چلائے گا۔

اپنے اس معاشی پروگرام کے حوالے سے قومی اتحاد نے عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی چنانچہ قومی اتحاد کے لیڈر جس راستے سے بھی گزرتے تھے غریب کسان کندھوں پر ہل اٹھائے ان کا استقبال کرتے تھے۔ لیکن جب یہ لوگ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنے اس دعوے پر عمل کرنا تو کجا اس کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب عوام سیاسی پارٹیوں سے مایوس ہو گئے ہیں اور اس قومی اتحاد کے خطوط پر قائم کردہ نئی سیاسی تحریک، تحریک بحالی جمہوریت سے لا تعلق رہے ہیں۔ اس تحریک میں وہ سب لیڈر موجود ہیں۔ جو قومی اتحاد کے روح رواں تھے۔ لیکن چونکہ عوام کے معاشی مسائل کے بارے میں سرد مہری سے کام لیا گیا۔ اس لئے عوام نے بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی چنانچہ اب تحریک کے لیڈروں کو اپنی اس فردگذاشت کا احساس ہو چکا ہے اور وہ قوم کے سامنے معاشی پروگرام پیش کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

شریعت اسلامی اس ملک میں کبھی بھی متنازعہ مسئلہ نہیں رہی۔ عوام صدق

دل سے اس ملک میں اس کا نفاذ چاہتے ہیں لیکن اگر شریعت اسلامی کی ایسی تعبیر کی جائے گی جس کا عوام کے معاشی مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو تو پھر یہ انہیں متاثر نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ شریعت بل کی حالیہ تحریک کے دوران اس کے علمبرداروں کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا ہے ان دنوں ملک میں دو اہم معاشی مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے ایک تو یہ کہ زمیندار لوگ جو ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہیں ان پر زرعی ٹیکس لگا کر غریب عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کیا جائے۔ دوسرا مسئلہ بددیانت سرکاری افسروں اور بددیانت تاجروں کی ملی بھگت سے قومی خزانے کو پچاس ارب روپے کی آمدنی سے محروم کر دینا ہے یہ مسئلہ اتنا اہم تھا کہ خود وزیراعظم پاکستان کو بنفس نفیس اس کے خلاف مہم چلانے کا فیصلہ کرنا پڑا جس کا عوام نے بھرپور استقبال کیا یہاں تک کہ وزیراعظم کے سیاسی مخالفین کو بھی اس مہم کے مثبت نتائج کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ شریعت بل کے علمبردار اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت بل کے حق میں چلائی جانے والی تحریک میں عوام نے کوئی دلچسپی نہ لی۔

یہ صورت حالات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اگر شریعت بل کے علمبردار اس بل کے لئے عوامی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں عوام کو درپیش معاشی مسائل کا حل، شریعت اسلامی کی روشنی میں پیش کرنا ہو گا مثلاً ان میں سے اہم ترین مسئلہ زرعی ٹیکس کا ہے اس مسئلہ کے بارے میں شریعت اسلامی کے احکامات اتنے واضح ہیں کہ امت مسلمہ کے فقہاء میں کوئی ان سے اختلاف نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ تاریخ کے تمام اسلامی ادوار میں ان احکامات پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ان احکامات کے مطابق کاشت کار کی زرعی پیداوار کا ایک حصہ جو اس وقت غیر حاضر زمیندار وصول کرتے ہیں سرکاری بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔ اس مد سے اتنی زیادہ آمدنی حاصل ہو جاتی تھی کہ وہ ہر دور کی اسلامی حکومت کے اخراجات کے لئے کافی ہوتی تھی۔ اس لئے عوام پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاتا تھا۔ آج اسلامی ریاست کی آمدنی کا یہ حصہ غیر

حاضر زمیندار ناجائز طور پر ہڑپ کر جاتے ہیں اور حکومت اپنا انتظام چلانے کے لئے غریب عوام پر ٹیکس لگاتی ہے جس نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اسی طرح ناجائز کمائی کو روکنے کے لئے اسلامی احکامات اتنے مؤثر ہیں کہ اسلامی معاشرے میں کسی بددیانت آدمی کا زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کیونکہ وہ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ اپنی آمدنی کو خرچ ہی نہیں کر سکتا۔ مثلاً ان دنوں اس ناجائز کمائی سے محل نما کوٹھیاں تعمیر کی جاتی ہیں جبکہ اسلامی معاشرے میں ان کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہر بڑے سے بڑے آدمی کو ویسے ہی سادہ سے مکان پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو ایک عام مسلمان کو میسر ہو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں اتنا التزام کرتے تھے کہ وہ کسی صحابی کو اس کی ضرورت سے زیادہ مکان بنانے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔

مبادا کہ اسے دوسرے صحابہ پر فوقیت حاصل نہ ہو جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ خود بھی ایک سادہ سے مکان میں رہائش رکھتے تھے اور صحابہ سے بھی اسی کی توقع کرتے تھے ایک دفعہ جب ایک صحابی نے اپنی حلال کی کمائی سے اپنے مکان کی ایک دوسری شاندار منزل بنالی تو آپ نے اس کا سماجی مقاطعہ کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ صحابی اپنی اس نئی عمارت کو گرانے پر مجبور ہو گئے۔ (سنن ابو داؤد جلد دوم ص ۶۵۰)

ناجائز آمدنی کے خرچ کرنے کی دوسری بڑی مد شادی کی تقریبات ہیں جن پر آج کل لاکھوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ پھر لاکھوں کا جینز اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی مثالوں سے ان دونوں رسوم کا اسلامی معاشرے سے اس طرح قلمح قمع کر دیا تھا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی عرب ممالک میں ان کا نشان نہیں ملتا آپ نے اس شادی کو سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا جس پر سب سے کم خرچ ہوا اور یہ خرچ بھی ہونے والا خاوند ہی برداشت کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے گھر میں پرورش پاتے تھے آپ ان کی شادی کے

اخراجات کا انتظام بھی کر سکتے تھے لیکن جب ان کی شادی ہوئی تو آپ نے انہیں اس کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لئے کہا اس مقصد کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی زرہ بکتر فروخت کرنی پڑی۔ اسی طرح آپ نے مسلمان عورتوں کو سونے کے زیور پہننے سے بھی منع فرمادیا اور انہیں تلقین کی کہ وہ صرف چاندی کے زیور پہنیں جنہیں تمام مسلمان اپنی عورتوں کو مہیا کر سکتے تھے۔ (سنن ابوداؤد جلد

دوم ص ۴۱۰)

ان تفصیلات کی روشنی میں شریعت بل کے علمبرداروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام کو درپیش مسائل کا شریعت اسلامی کی روشنی میں حل پیش کریں اس طرح وہ اپنے بل کے لئے ان کی بھرپور تائید حاصل کر سکتے ہیں۔ (جولائی ۱۹۸۷ء)





## قرآن و سنت کا قانون یا حنفی فقہ

آج کل ہمارے اخبارات میں آئین میں مجوزہ نویں ترمیم کے بارے میں بحث جاری ہے۔ اس ترمیم کا بل وفاقی وزیر قانون جناب اقبال احمد خان صاحب نے ۲۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو سینٹ میں پیش کیا تھا، اس ترمیم کے ذریعے ملک عزیز میں قرآن و سنت پر مبنی اسلامی احکامات کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے اس ترمیم کے حوالے سے علماء کے ایک طبقے نے یہ تاثر دینا شروع کیا کہ اس کے ذریعے عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کو ختم کیا جا رہا ہے۔ بلکہ بعض حضرات نے تو اس کے حوالے سے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر موجودہ پارلیمنٹ اسلام کے بارے میں مخلص ہے تو وہ نویں ترمیم پاس کر کے عائلی قوانین کا خاتمہ کر دے۔

اس تاثر نے عائلی قوانین کی حمایت کرنے والی خواتین کو اس ترمیم کی مخالفت پر ابھارا۔ انہوں نے اس کے خلاف ایک جلوس نکالا اور مختلف طریقوں سے اس ترمیم کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انہوں نے شکایت کے انداز میں کہا کہ ملک کو درپیش مسائل کے بارے میں علماء کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام صرف عورتوں کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ دوسرے مسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک مثال دی کہ چند دن پہلے اخبارات کے

ایک ہی صفحہ پر دو خبریں شائع ہوئی تھیں ایک عورتوں کی ہاکی ٹیم کے دورے کے بارے میں اور دوسری گھوڑ دوڑ کے پردے میں جو اکھیلنے کے بارے میں تھی۔ لیکن تقریباً تمام علماء حضرات نے ہاکی ٹیم کے بارے میں تو اپنے بیانات جاری کئے۔ لیکن گھوڑ دوڑ کے پردے میں ملک عزیز میں جوئے کا جو کاروبار چل رہا ہے اور جسے وفاقی شرعی عدالت بھی خلاف اسلام قرار دے چکی ہے اس کے بارے میں ان میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

علماء کی جانب سے عورتوں کے اس جلوس کی سخت مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ سینٹ اس ترمیم کو فوری طور پر منظور کرے۔ بعض علماء کی جانب سے سینٹ کے اراکین پر یہ الزام بھی لگایا جا رہا ہے کہ وہ جان بوجھ کر لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں۔ اس ترمیم کی حمایت اور مخالفت کرنے والوں کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو علماء حضرات نے اور نہ ہی اس کی مخالفت کرنے والی خواتین نے ترمیم کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا ہے وگرنہ ان دونوں طبقات کا رد عمل مختلف ہوتا۔

اس ترمیم کے ذریعے دو اہم معاملات جنہیں پہلے تحفظ حاصل تھا اور وہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار سے باہر تھے انہیں عدالت کے دائرہ کار کے تحت لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ دو معاملات، عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء اور دوسرا مروجہ سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ترمیم میں کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ جس کے نتیجے میں عائلی قوانین کو تو مزید کوئی تحفظ نہیں دیا گیا جب کہ اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام جس کی بنیاد سود پر ہے اور جو قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔ اسے کچھ مزید تحفظ دیا گیا ہے۔

اس مقصد کے لئے ترمیم کی دفعہ (۵۳) کے ذیل میں یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ اگر وفاقی شرعی عدالت کسی مالیاتی معاملے کو اسلامی امور کے ماہرین کے مشورے

سے اسلامی احکامات کے خلاف قرار دے دے تو اس سلسلے میں متبادل انتظام کے لیے مناسب تجاویز دے اور اس خلاف اسلام قانون کو تبدیل کرنے کے لیے مناسب مہلت بھی دے۔ پھر ذیلی دفعہ (۳ب) کے مطابق مالیاتی امور سے متعلق، خلاف اسلام قرار دیئے گئے قوانین بھی اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے کہ جب تک قانون ساز اسمبلیاں اس بارے میں نئے قوانین نہیں بنا لیتیں۔

خیال رہے کہ اسلام کے مالیاتی نظام کی بنیاد غیر حاضر زمینداری نظام کے خاتمے پر استوار ہوتی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے ہماری قانون ساز اسمبلیوں کے زیادہ تر اراکین اسی طبقے سے منتخب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یہ لوگ کبھی بھی ایسے کسی اقدام کی حمایت نہ کریں گے کہ جس سے غیر حاضر زمینداری نظام کا ملک سے خاتمہ ہو جائے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس ملک میں کبھی بھی اسلام کا مالیاتی نظام نافذ نہ ہو سکے گا۔

عائلی قوانین کے خاتمے کے بارے میں جس خوش فہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ بھی اس ترمیم کا غور سے مطالعہ نہ کرنے کی بنا پر ہے اور جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس ترمیم سے عائلی قوانین ختم ہو جائیں گے وہ غلطی پر ہیں اس ترمیم سے تو عائلی قوانین کو مزید تقویت ملے گی۔ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل مثال سے ہوگی۔

ترمیم میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ملک عزیز میں ایسے اسلامی احکامات کی بالادستی ہوگی جو قرآن و سنت پر مبنی ہوں گے عائلی قوانین کی مخالفت اس بنا پر نہیں کی گئی تھی کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ حنفی فقہ کے خلاف ہیں جن کی پیروی اس ملک کی اکثریت کرتی ہے۔ ان عائلی قوانین میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے کے مروجہ طریقے کو ختم کر کے، اس کی بجائے ایسا طریقہ رائج کیا گیا ہے جو سنت کے عین مطابق ہے اس لیے عائلی قوانین کے مخالفین نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ یہ تبدیلی قرآن و سنت کے خلاف ہے بلکہ فرمایا:

”بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے۔ لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے، حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں۔ تو اس سے طلاق مغلہ واقع ہو جاتی ہے، اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ ہی عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے۔ جب تک اس کی تحلیل نہ ہو جائے اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے، ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب حنفی کے فقہاء کے علم و تقویٰ پر ہے، وہ اعتماد آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔ (عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحات ۱۹، ۱۸، مطبوعہ پبلک آرٹ پریس پشاور)

ہمارے ملک میں جو عائلی قوانین نافذ ہو چکے ہیں وہ یہاں کے تجد و پسندوں کا کارنامہ نہیں، جیسے کہ بعض حلقوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے یہ ان عائلی قوانین کے مطابق ہیں جو مصر میں ۱۹۲۹ء میں رائج ہوئے تھے اور ہمارے علماء نے ان کی بڑی تعریف کی تھی، یہاں تک کہ مولانا مودودی صاحب نے انہی کی بنیاد پر اپنی کتاب حقوق الزوجین لکھی۔ راقم ایک علیحدہ مضمون میں قارئین امروز کے سامنے، عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء اور مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین کا تقابلی مطالعہ پیش کر چکا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں اصل میں ایک ہی منبع سے لیے گئے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بعض لوگوں کو جو یہ خوش فہمی ہے کہ نویں ترمیم کے ذریعے عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء منسوخ ہو جائیں گے تو یہ ان کی محض خوش فہمی ہے۔ اس ترمیم کے ذریعے تو وہ مزید پختہ ہوں گے۔ البتہ اس ترمیم کے ذریعے اسلام کے مالیاتی نظام کے نفاذ کا معاملہ ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لیے اس ترمیم کی حمایت اور مخالفت کرنے والے طبقات سے توقع کروں گا کہ وہ ایسا کرنے سے پہلے اس کے مسودے کا اچھی طرح مطالعہ کر لیں۔

(مارچ ۱۹۸۶ء)

## اسلامی معاشرہ سے فرقہ پرستی ختم کرنے کی کوشش

مسلمانوں میں فرقہ پرستی نے ہر دور کے مسلمان مفکرین کو پریشان رکھا ہے۔ انہوں نے اسے اسلامی معاشرے سے ختم کرنے کے لیے کئی اقدامات کئے لیکن بوجہ یہ برائی ختم نہ ہو سکی۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ دوسری قومیں اپنے نئے سال کے شروع ہونے پر خوشیاں مناتی ہیں لیکن مسلمان عوام کو یہ خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شریعت لوگ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آپس میں لڑانہ دیں چنانچہ مذہبی رہنما نئے اسلامی سال کے شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی اپیلیں کرنی شروع کر دیتے ہیں۔

یکم اگست ۱۹۸۸ء کو اسلام آباد میں ساتویں حسینیہ کانفرنس کا انعقاد بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور مسلمانوں کے ہر فرقے سے اپیل کی کہ وہ شریعتوں کو شرارت کرنے کا کوئی موقع نہ دیں۔

قرآن مجید نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے جو شریعت اسلامی کے مطابق سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

”اور تم لوگ مشرکین میں سے نہ بنو، ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور پھر وہ گروہ گروہ بن گئے اور پھر ہر گروہ اس میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔“ (سورۃ الروم - ۳۲)

مسلمانوں میں فرقہ بندی کی ابتداء ملوکیت سے ہوئی۔ ملوکیت اپنے آپ کو قائم ہی اسی صورت میں رکھ سکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھائے رکھے۔ اس حقیقت کی تصدیق اس امر سے بھی ہوئی ہے کہ ایران میں ملوکیت کے خاتمے کے بعد، وہاں کے شیعہ لیڈروں نے بھی ایسے اقدامات اٹھائے کہ اگر ان پر صدق دلی اور نیک نیتی سے عمل کیا جائے تو اسلامی معاشرہ سے فرقہ بندی اور فرقہ پرستی دونوں ختم ہو سکتے ہیں۔ جمہوریہ اسلامیہ ایران کے سب سے بڑے مذہبی اور سیاسی لیڈر امام خمینی کا تعلق اگرچہ شیعہ فرقے سے ہے لیکن انہوں نے اپنے قول و فعل سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان کا تعلق کسی خاص فرقے سے ہے بلکہ مسلمانوں سے فرقہ بندی ختم کرنے کے لیے کچھ عملی اقدامات اٹھائے جن کے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

نماز اسلام میں سب سے بڑی اور اہم عبادت ہے ہر مسلمان کو دن میں پانچ دفعہ یہ عبادت ادا کرنی ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر، اس عبادت کو باجماعت ادا کرے لیکن دکھ کی بات ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علماء ایک دوسرے کی اقتدار میں نماز ادا نہیں کرتے چنانچہ فرقہ بندی ختم کرنے کے لیے امام خمینی نے اپنے فرقہ کے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وہ اہل سنت اماموں کی اقتدار میں نماز ادا کریں ان کے اس حکم پر مختلف اسلامی ملکوں میں مختلف فرقوں کے لوگوں نے عمل کیا اور عوام سے ہر فرقے کو مسلمانوں کو ایک امام کی اقتدار میں نماز باجماعت ادا کرنے کے روح پرور نظارے دیکھے۔ اس سے مختلف فرقوں کے درمیان فاصلے کم ہوئے اور دوسرے ممالک سے اہل سنت علماء کے کئی وفد امام خمینی سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔

بعض عالی شیعہ صحابہ کرام کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جب اس معاملے کو امام خمینی کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے حکم دیا کہ شیعہ لزیچ سے اس قسم کے الفاظ فوراً حذف کر دیئے جائیں اور آئندہ کوئی بھی شخص اس کا ارتکاب نہ کرے۔ امام خمینی کی اس مثبت کوشش کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اور اگر ان کی خواہشات کو مد نظر رکھے ہوئے اسلامی قانون کی اس طرح تدوین کی جائے کہ مختلف فقہی مذاہب کے جو مسائل قرآن و سنت کے زیادہ قریب ہیں انہیں اختیار کر کے ایک متفقہ فقہ مرتب کر لی جائے تو اس سے مسلمان معاشرے سے فرقوں کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے کچھ عملی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

اسلامی قانون کے مطابق چوری کی شرعی حد ہاتھ کاٹنا ہے۔ اکثر فقہی مذاہب کے نزدیک مجرم کا ہاتھ پنجے سے کاٹنے کا حکم ہے۔ لیکن اس بارے میں جعفریہ فقہ کا فتویٰ قرآن مجید کی تعلیمات سے زیادہ قریب ہے۔ اس فقہ کے امام نے سورۃ البقرہ کی آیت ۷۹ سے اس بارے میں استدلال کیا ہے جس میں ارشاد ہے۔

ترجمہ:- ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی گئی۔ (البقرہ- ۷۹)

اس آیت میں ہاتھ سے لکھنے کے جو الفاظ ہیں، تو ان سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ عملاً لکھا تو انگلیوں سے جاتا ہے۔ جن پر ہاتھ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس لیے چوری کے جرم کی سزا کے طور پر ہاتھ کاٹنے کا جو حکم ہے تو اس کے لیے صرف انگلیوں کا کاٹنا کافی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق بانی فقہ جعفریہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مجرم چوری کی سزا پانے کے باوجود نماز ادا کرنے کے قابل رہے گا۔ جبکہ ہاتھ کاٹے جانے کی صورت میں اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا

(و مسائل الشیعہ جلد ۸ باب چہارم)

اسی مثال کی روشنی میں اسلامی قانون کی تدوین جدید اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہر اسلامی فرقے کے وہ مسائل اور فتاویٰ سے لیے جائیں جو قرآن و سنت کے قریب ہیں۔ حکومتی سطح پر اسلامی قانون کی تدوین کا جو کام ہو اس کے لیے بھی یہی اصول اپنایا جائے اور ہمارے علماء بھی اسی اصول کو مد نظر رکھیں۔ آخر تمام فقہی مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی تھے یعنی قرآن و سنت اور اس ایک سرچشمے کی طرف لوٹ جانے سے مسلمان معاشرے سے فرقہ بندی ختم ہو سکتی ہے تو اس طرف کیوں نہ پیش رفت کی جائے۔ کیا ہی اچھا ہو۔ ہم اس معاملے کو اولین اہمیت دے تاکہ ہمارے معاشرے سے فرقہ بندی کا زہر ختم ہو جائے اور شریکوں کو مسلمان عوام کو ایک دوسرے سے لڑانے کے احکامات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ (اگست ۱۹۸۸ء)





## شریعت اسلامی میں تفرقہ بازی کی مذمت

ان دنوں ہمارا معاشرہ تفرقہ بازی کی زد میں آیا ہوا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اسلام جو اس برائی کی مذمت کرتا ہے اسی کے نام پر اسے عروج دیا جا رہا ہے اسی کے نتیجے میں جھنگ کے ایک عالم دین کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں قرآن مجید میں فرقہ بازی کو فرعونی عمل قرار دیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو فرقوں میں بانٹ رکھا تھا اور اپنی حکومت کو بچانے کے لیے ان فرقوں کو آپس میں لڑائے رکھتا تھا۔

فرقہ پرستی اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے اسلام کی بنیادی تعلیمات توحید الہی کے محور کے ارد گرد گھومتی ہیں اسلام کے اس بنیادی عقیدے یعنی توحید الہی کا تقاضا ہے اس کے ماننے والے بھی ایک ہی وحدت ہوں ان میں کسی قسم کی فرقہ واریت نہ ہو۔ چنانچہ اس برائی سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا۔

(ترجمہ) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور فرقے نہ بناؤ (سورہ آل عمران - ۱۰۳) قرآن مجید کی اس آیت میں مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کے لئے جس لفظ ”جبل“ کا ذکر کیا گیا ہے اردو زبان میں اس کے لفظی معنی تو ”رسی“ کے ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید کے تمام مفسرین نے اس سے مراد خود قرآن مجید ہی لیا

ہے ان کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان اپنے آپ کو صرف قرآن مجید کی تعلیمات تک محدود رکھیں گے تو وہ ہر قسم کی فرقہ بازی سے بچے رہیں گے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مسلمانوں نے صرف قرآن مجید کا دامن پکڑے رکھا وہ ہر قسم کی فرقہ بازی سے محفوظ رہے۔

مسلمانوں کی وحدت کو توحید الہی سے مربوط کیا گیا ہے توحید الہی کے مقابلے میں شرک ہے شرک سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک کیا جائے ایسا کرنا شریعت اسلامی میں سب سے بڑا گناہ ہے قرآن مجید میں اسے عظیم ظلم قرار دیا گیا ہے مسلمانوں کی وحدت کو ختم کرنے والی چیزوں کو بھی قرآن مجید نے شرک قرار دیا ہے وحدت کو ختم کرنے والی سب سے بڑی برائی تو یہی فرقہ بازی ہے چنانچہ سورہ الروم میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرک نہ بنیں اور آپس میں فرقے نہ بنائیں (سورہ الروم - ۳۱) مختصر یہ کہ مسلمان اور فرقہ بندی دو متضاد چیزیں ہیں۔

فرقہ بازی سے معاشرے کا امن ختم ہو جاتا ہے ایک فرقہ دوسرے فرقے کو نیچا دکھانے بلکہ بعض اوقات اسے ختم کرنے میں مشغول رہتا ہے ظاہر ہے کہ اس کے اس طرز عمل سے معاشرے کا سکون برباد ہو جاتا رہے اس لئے اسلام نے صرف اسلامی معاشرے ہی سے نہیں بلکہ ساری دنیا سے فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا اور اس برائی کے خاتمے کا طریقہ کار بھی خود ہی متعین فرما دیا جب مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس کے آس پاس کے علاقوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی حکیم کے بموجب ان کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی کوشش فرمائی انہیں یہ قرآنی حکم ان الفاظ میں دیا گیا تھا۔

(ترجمہ) کہ دیجئے کہ اے اہل کتاب (مراد یہودی اور عیسائی تھے) اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفقہ ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوائے

کسی دوسرے کی عبادت نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بنائیں گے لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ منہ موڑیں تو پھر گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں (سورہ آل عمران - ۶۳)

دیکھئے اس آیت میں مسلمان کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک ہوتا ہے اور ساری دنیا سے اس برائی کا خاتمہ چاہتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے جب آس پاس کے غیر مسلم بادشاہوں کو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے خطوط لکھے تو ان کی ابتداء سورہ آل عمران کی اس آیت سے کی جس کا ترجمہ سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے اس آیت میں وہ اصول بھی بتا دیا ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کا غیر مسلموں سے اتحاد قائم ہو سکتا ہے مسلمانوں نے اس اصول کے تحت مختلف تاریخی ادوار میں غیر مسلموں سے اتحاد کیا تو کیا وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اس اصول کی روشنی میں اتحاد کیوں قائم نہیں ہو سکتا۔

اس قرآنی اصول کے مطابق مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو پہلے ان مسائل کو مشترک طور پر اپنالینا چاہیے جن کے بارے میں ان میں کوئی اختلاف نہیں قرآن مجید اصول کی کتاب ہے اور اس میں اسلامی تعلیمات کے اصول بیان ہوئے ہیں جن کی روشنی میں رسول اللہ صلعم نے بعض عملی معاملات کی وضاحت کی جسے شریعت اسلامی کی اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے مسلمان فقہاء نے قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے زمانے کے معاملات کے بارے میں فتاویٰ جاری کئے کیونکہ مختلف علاقوں کا ماحول اور مسائل مختلف تھے اس لئے ان کے فتاویٰ میں بھی اختلاف تھا لیکن بعد میں جب مسلمانوں میں تقلید جامد کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی کہ مختلف فقہاء کے فتاویٰ میں یہ فرق کیوں ہے بلکہ ان فتاویٰ پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے لگے فقہاء کے مختلف فتاویٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں مختلف فرقے وجود میں آ گئے۔

قرآن مجید میں اسلامی تعلیمات کے اصولوں کے علاوہ اہم معاملات کے بارے میں احکام بھی دیئے گئے ہیں ان احکامات کے بارے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں لیکن موجودہ دور کے مفاد پرست لوگوں نے ان متفقہ احکامات کو بھی متنازعہ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ مسلمانوں میں کبھی اتحاد قائم نہ ہو سکے مثلاً قرآن مجید نے ہر قسم کے سودی معاملے کو حرام قرار دے دیا اور اسے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے برابر قرار دیا مسلمانوں میں اس کے حرام ہونے کے ہونے کے بارے کبھی اختلاف نہیں رہا اگر مسلمان سود کے بارے میں شریعت کے احکامات پر عمل کرنے لگ جائیں تو پھر دوسرے اختلافی مسائل کا بھی حل نکل سکتا ہے لیکن جو لوگ مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیتے انہوں نے سود جس کے حرام ہونے پر امت مسلمہ متفق تھی کو اب اختلافی مسئلہ بنا دیا پھر مفاد پرست علماء نے سود کی بعض اقسام کو اپنے لئے جائز قرار دے دیا اب صورت حال یہ ہے کہ شریعت اسلامی کے وہ متفقہ احکامات جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ بھی اختلافی بنا دیئے گئے اور اس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں فرقہ داریت کو عروج حاصل ہو رہا ہے۔

ہمارا یہ عمل قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف ہے معاشرے سے فرقہ داریت ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب مسلمان صدق دل سے ان احکامات پر عمل کریں جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں امت مسلمہ کے علماء کے درمیان کبھی اختلاف نہیں رہا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے سود ان میں سے ایک ہے مسلمان اگر اس بارے میں یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ہر اس معاملے کو جو سودی ہو یا جس میں کوئی سود کا شائبہ پایا جاتا ہو ترک کر دیں گے تو پھر جو لوگ متفقہ شرعی مسائل کو اختلافی بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ نامراد ہو جائیں گے اور متفقہ مسائل پر کامیابی سے عمل کرنے کے بعد اختلافی مسائل پر بھی متفقہ عمل کرنے کی ضرورت نکل آئے گی۔

خود قرآن مجید نے بھی معاشرے سے فرقہ داریت ختم کرنے کا یہی نسخہ تجویز

کیا ہے کہ مسلمان قرآن مجید کی تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑ لیں یعنی ان پر صدق  
 دل سے عمل کریں آج فرقہ پرستی نے ہمارے معاشرے کا سکون برباد کر رکھا ہے اس  
 لئے سب مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ وہ اسے ختم کرنے کی کوشش کریں اور اس  
 مطلب کے لئے وہی طریق کار اختیار کریں جو خود اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور جس کی  
 تفصیلات سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہیں۔ (مارچ ۱۹۹۰ء)





تیسرا حصہ

اسلامی طریقہ تفتیش

پانچواں



## اسلامی طریقہ تفتیش سے مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح ہو جاتی

ہے۔

پولیس تفتیش کے دوران بعض ملزموں کا موت کو گلے لینا ایک معمول کی بات سمجھی جاتی تھی لیکن پچھلے کچھ عرصے سے ان اموات کی مسلسل خبریں آنے لگیں۔ تو مختلف مقامات پر لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان احتجاج کرنے والوں کو مختلف طریقوں سے خاموش کر دیا گیا لیکن ابھی تک کسی ایسے پولیس اہل کار کے خلاف جو اس قسم کی موت کا ذمہ دار ہو۔ کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

عوام نے پولیس کے ان مظالم کے خلاف اپنے آپ کو منظم کرنے کے لئے ایک تنظیم قائم کی ہے جس کا نام ”تشدد کے خلاف احتجاج“ اس تنظیم کی جانب سے حال ہی میں ایک کانفرنس کا انتظام کیا گیا جس میں ایک سابق پولیس افسر نے بتایا کہ پولیس کے یہ مظالم ان کے ناتربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے ہیں انہیں تفتیش کے طریقوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہیے۔ کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا کہ ہماری پولیس اس مقصد کے لئے جو تیسرے درجے کے غیر شریفانہ طریقے استعمال کرتی ہے ان پر پابندی لگادی جائے۔ اس وقت دنیا میں جرائم کی تفتیش کے لئے جو نئے طریقے اختیار

کئے جاچکے ہیں ہماری پولیس کو بھی ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے پولیس ملزم کو مارنے سے احتراز کرے کیونکہ ملزموں کی اکثر اموات پولیس کی اس مار پیٹ کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہیں۔

تفتیش کے نئے طریقے علم نفسیات پر مبنی ہیں اور ملزم کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ایسے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں کہ ملزم خود شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اقبال جرم کر لیتا ہے۔ ہمارے ملک میں علم نفسیات تقریباً تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے لیکن جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں کبھی اس علم سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا حالانکہ ہر سال ہزاروں نوجوان اس علم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس لئے کیا ہی اچھا ہو کہ آئندہ مختلف سطح کے پولیس اہل کاروں کے لئے اہلیت کی جو شرطیں مقرر کی جائیں ان میں نفسیات کے علم کا حصول لازمی قرار دیا جائے۔

جن حضرات نے اسلامی طریقہ تفتیش کا مطالعہ کیا ہو گا وہ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جدید نفسیاتی طریقہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں اور خود رسول اکرمؐ نے معاشرے سے جرائم کے خاتمہ کے لئے ان طریقوں کو استعمال کیا تھا۔ اس سلسلے میں آپؐ نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اس کے مطالعہ سے سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں جرائم کا ارتکاب عام طور پر ایسے لوگ کرتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی وجہ سے محرومی کا احساس دلا دیا گیا ہو پھر یہ محرومی کسی شخص میں کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ اگر متعلقہ فرد کی اس محرومی کو ختم کر دیا جائے تو پھر وہ شخص جرائم کے ارتکاب سے باز آجاتا ہے۔ شریعت اسلامی میں جرائم کی سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں لیکن رسول اکرمؐ نے جس نرمی سے ان سزاؤں کا نفاذ کیا تو مجرم لوگ خود بخود اپنے آپ کو آپؐ کے سامنے پیش کرنے لگے۔ مجرموں کے ساتھ آپؐ کا رویہ پولیس والا نہیں تھا بلکہ مشفقانہ تھا اور آپؐ نے یہ رویہ قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں اختیار کیا تھا قرآن مجید میں ملزموں کو دھتکارنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پیارے بندے کہہ کر خطاب کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

(ترجمہ..... اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ (سورۃ

الزمر ۵۳)

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجرموں کو اپنے بندے کہہ کر خطاب کیا ہے اور ان کے جرائم کو ان کے اپنے نفسوں پر ظلم سے تعبیر کیا ہے چنانچہ رسول اکرمؐ نے بڑے بڑے مجرموں سے اس قرآنی آیت کی روشنی میں سلوک کیا مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے آس پاس کی پہاڑیوں میں ایک عادی مجرم رہتا تھا جس نے اہل مدینہ کی زندگیوں کو ان کے لئے اجیرن بنا رکھا تھا۔ جب اس نے سنا کہ رسول اللہؐ مجرموں سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں تو وہ دوڑتا ہوا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے جرائم پر شرمندگی کا اظہار کیا آپؐ مجرموں کی اس شرمندگی کو توبہ کے برابر قرار دیتے تھے اور انہیں کوئی سزا نہیں دیتے تھے۔

اس مجرم نے شرمندگی کے اظہار کے باوجود کہا کہ مجھے ان جرائم کی عادت اس بری طرح پڑ چکی ہے کہ میں آسانی سے انہیں ترک نہیں کر سکتا اے اللہ کے رسولؐ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میں ان جرائم سے نجات پا جاؤں آپؐ نے اس مجرم سے کہا کہ میرے ساتھ ایک وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ چاہے حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس نے خوشی خوشی رسول اکرمؐ سے یہ وعدہ کیا اور چلا گیا جب رات کا اندھیرا چھایا تو اس مجرم کے اندر کا چور جاگا اور اس نے چوری کرنے کا ارادہ کیا لیکن فوراً ہی اسے رسول اللہؐ سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آ گیا اور دل میں خیال کیا کہ چوری کے جرم کے کھار تکاب کے بعد وہ کس منہ سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گا چنانچہ یہ سوچنے کے بعد وہ اس رات چوری کے ارتکاب سے باز آ گیا اس طرح دوسرے دن اس نے کسی اور جرم کے ارتکاب کا ارادہ کیا تو اسے پھر حضور اکرمؐ کا وعدہ یاد آ گیا تو وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا اور اس طرح اس جرم کے ارتکاب سے بچ گیا رفتہ رفتہ اس نے تمام جرائم سے نجات حاصل کر لی اور اسلامی معاشرے کا ایک مفید شہری بن گیا۔

شرعی حدود میں اگرچہ سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں لیکن اس بارے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ شرعی حدود کے نفاذ سے پہلے مجرموں کو شک کا فائدہ دو مقصد اصلاح ہے کسی کو تکلیف دینا نہیں ہے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے دوران ان اسلامی اصولوں پر عمل ہوتا رہا جس کے نتیجے میں اسلامی معاشروں میں جرائم کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

جرائم کی تفتیش کے لئے ترقی یافتہ ممالک میں جو نفسیاتی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے وہ اس طریقے کی ترقی یافتہ شکل ہے جو رسول اللہؐ اور دوسرے مسلمان حکمرانوں نے استعمال کیا تھا لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ہمارا ملک جو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا اس کی پولیس اس اسلامی طریقے سے ناواقف ہے اور نہ ہی علماء حضرات نے انہیں کبھی اسلامی طریقے کی تفصیلات بتانے اور بیان کر نیکی زحمت گوارا کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے تفتیش کے لئے جو ظالمانہ طریقے استعمال کئے تھے ہماری پولیس ابھی تک انہیں اپنائے ہوئے ہے اسے اس سے غرض نہیں کہ ان طریقوں کے استعمال سے کسی مجرم یا ملزم کی جان جاتی ہے یا نہیں، کیونکہ ابھی تک کسی ایسے پولیس والے کا احتساب نہیں کیا گیا کہ جس نے تفتیش کے دوران ملزموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ جرائم کی تفتیش کے لئے نفسیات کے علم سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے پولیس کے اعلیٰ افسروں کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ انہوں نے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی ہو ہمارے ہاں ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں جنہوں نے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم اختیار کر رکھی ہے لیکن ان کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا تقاضا ہے کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور جرائم کی تفتیش کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔ جس میں پولیس کے لئے تیسرے درجہ کے طریقوں کے استعمال کی گنجائش ہی نہ رہے۔ خیال رہے کہ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں بھی آج سے کچھ عرصہ پہلے تک

جرائم کی تفتیش کے لئے ہماری پولیس کی طرح کے وحشیانہ طریقے استعمال کئے جاتے تھے کیونکہ ان دونوں ممالک نے یہ طریقے غیر ملکی حکمرانوں سے ورثے میں پائے تھے لیکن اب وہاں ان طریقوں کو ترک کیا جا چکا ہے اور علم نفسیات سے فائدہ اٹھا کر مجرموں کی اصلاح کی جا رہی ہے۔

عوام کو اس بارے میں حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ اب کسی صورت میں پولیس کو تیسرے درجہ کے طریقے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور اگر کوئی مجرم کسی پولیس افسر کے تشدد کی وجہ سے ہلاک ہو جائے تو اس پولیس افسر کو تختہ دار پر لٹکایا جائے اور ہمارے بڑے بڑے قانون دان حضرات جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اگر وہ تشدد کے مجرم کسی ایک پولیس افسر کو بھی تختہ دار پر لٹکا دیں تو جرائم کی تفتیش کے وحشیانہ طریقے ہمارے معاشرے سے ختم ہو سکتے ہیں۔ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)



## جرائم کی تفتیش کا اسلامی طریقہ

حال ہی میں اسلام آباد میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ جرائم کی تفتیش۔ جدید سائنسی طریقے پر کی جائے اور پولیس اس مقصد کے لیے کہ جو تیسرے درجے کے طریقے استعمال کرتی ہے ان کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ پولیس تشدد کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ایک انجمن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے جس کا نام ہے VOICE AGAINST TORTURE یعنی تشدد کے خلاف احتجاج جن حضرات نے جرائم کی تفتیش کے جدید طریقوں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام نے آج سے چودہ سال پہلے ٹھیک ٹھیک یہی طریقے استعمال کیے۔

یہ جدید طریقے علم نفسیات پر مبنی ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ نفسیات کو جدید علم سمجھا جاتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لیے ٹھیک ٹھیک وہی طریقے اختیار کیے جنہیں آج سائنسی طریقوں کا نام دیا جاتا ہے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریق کار اختیار کیا اس کے مطالعہ سے سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں جرائم کا ارتکاب عام طور پر ایسے لوگ کرتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی وجہ سے محرومی کا احساس دلا دیا گیا۔

پھر یہ محرومی کسی شخص میں تھوڑی ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ۔ اب اگر متعلقہ فرد کی اس محرومی کو ختم کر دیا جائے تو پھر وہ شخص جرائم سے بھی باز آجاتا ہے۔ شریعت اسلامی میں جرائم کی سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ان سزاؤں کا نفاذ کیا تو مجرم لوگ خود بخود اپنے آپ کو آپ کے سامنے پیش کرنے لگے۔ مجرموں کے ساتھ آپ کا رویہ مشفقانہ تھا اور یہ رویہ قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں تھا اللہ تعالیٰ نے ان مجرموں کو ان الفاظ میں خطاب کیا ہے۔

ترجمہ:- اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ (سورۃ

الزمر: ۵۳)

دیکھئے اس آیت شریفہ میں مجرموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کہہ کر خطاب کیا ہے اور ان کے جرائم کو ان کے اپنے نفسوں پر ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے مجرموں سے اس قرآنی آیت کی روشنی میں سلوک کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں مدینہ منورہ کا بدترین مجرم پیش ہوا جو چوری، زنا کاری ڈاکہ زنی، غرض کہ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتا تھا، آپ اس مجرم سے بڑی محبت سے پیش آئے وہ مجرم آپ کے رویے سے حیران رہ گیا کیونکہ ابھی تک اس کے ساتھ کسی نے اس پیار سے بات نہیں کی تھی اس نے آپ کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ وہ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتا رہا ہے اس لیے اے اللہ کے رسول مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ میری ان جرائم سے خلاصی ہو جائے آپ نے اس مجرم سے فرمایا کہ وہ صرف ایک وعدہ کرے کہ وہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ مجرم حیران تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے جرائم سے باز رہنے کی بجائے ایک معمولی سا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے آپ کے سامنے صدق دل سے عہد کیا کہ وہ آئندہ جھوٹ نہیں بولے گا اور دربار نبوی سے چلا گیا۔

جب رات کا اندھیرا چھایا تو اس کے اندر کا چور جاگا اور اس نے چوری کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جھٹ ہی اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آگیا کہ میں کس منہ سے ان کے حضور جاسکوں گا کیونکہ اگر وہ مجھ سے میرے کام کے متعلق پوچھیں گے تو مجھے اپنے اس فعل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سخت ندامت ہوگی چنانچہ اس سوچ بچار کے بعد وہ چوری کرنے سے باز آگیا، دوسرے دن اسے زنا کاری کا خیال آیا تو پھر وہ پہلے دن کی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا اور اس طرح اس جرم کے ارتکاب سے باز رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے تمام جرائم ترک کر دیے اور سچا مسلمان ہو گیا۔

جرائم کو ختم کرنے کا یہ طریقہ یورپی ممالک میں تو آزمایا جا رہا ہے لیکن حیرت ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے نہ تو وہاں کی پولیس اس طریقے سے باخبر ہے اور نہ ہی کبھی علماء حضرات نے اسے اپنانے کا مطالبہ کیا ہے، ہمارے ہاں جرائم کی تفتیش کے لیے ابھی تک صدیوں پرانا وہی طریقہ استعمال ہوتا ہے جو انگریزوں نے اپنے استعماری مقاصد کو تقویت دینے کے لیے رائج کیا تھا۔ اس طریقے کا استعمال تاریخ کے وحشیانہ ادوار کی یاد دلاتا ہے کیونکہ ملزم بعض اوقات جس کا جرم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسے اتنا مارا جاتا ہے کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس قسم کے ملزموں کی اموات کی خبریں روزانہ اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ خبر شائع نہیں ہوتی کہ بے قصور ملزموں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے پولیس کے کسی اہلکار کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ہو چنانچہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، بے گناہ ملزموں پر بے روک ٹوک ظالمانہ تشدد کیا جاتا ہے جس سے ان کی اموات واقع ہو رہی ہیں اور کوئی شریف شہری ان مظالم کے خلاف احتجاج نہیں کرتا۔ اس ماحول میں ”تشدد کے خلاف“ ”آواز“ نامی سوسائٹی کا قیام خوش آئند ہے اس سوسائٹی نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں مطالبہ کیا ہے کہ جرائم کی تفتیش کے لیے تیسرے درجے کے پولیس ہتھکنڈوں پر فوری پابندی لگائی جائے اور اس مقصد کے



لیے جدید سائنسی طریقوں کو اپنایا جائے۔

تاہم اس مطالبے کو قابل عمل بنانے کے لئے انہوں نے کوئی قابل عمل تجویز پیش نہیں کی، یورپ کی طرح جرائم کی تفتیش کا کام بھی ایسے پولیس افسروں کے حوالے کیا جائے۔ جنہوں نے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو بلکہ کیا ہی اچھا ہو کہ فوری طور پر ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدوں کے لیے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم کو بنیادی شرط قرار دیا جائے، ہمارے ہاں نفسیات کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کمی نہیں، لیکن ان کی خدمات سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا موجودہ زمانے کے حالات اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی اس فیلڈ میں علمی لیاقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں بھی پولیس یہی تیسرے درجے کے طریقے استعمال کرتی رہی ہے۔ لیکن اب یہ رجحان ختم ہو چکا ہے وہاں پر علم نفسیات کے ذریعے مجرموں کو تفتیش کی جا رہی ہے۔ لیکن ہم ابھی تک نو آبادیاتی نظام کے غیر انسانی وحشیانہ طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ جدید نفسیاتی طریقے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔

پولیس جس طرح بے گناہ شہریوں پر مظالم ڈھاتی رہتی ہے اس کے خاتمے کے لئے صرف اسلام آباد میں قائم ہونے والی سوسائٹی ہی کافی نہیں بلکہ ہر دردمند شہری کو اس صورت حالات کا نوٹس لینا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی زیر تفتیش ملزم موت کے گھاٹ نہ اتارا جاسکے اگر اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آجائے تو شہریوں کی ایسی انجمن ہونی چاہیے جو اس قسم کے پولیس اہلکاروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے قانونی کارروائی کر سکے۔ ہمارے ملک میں بڑے بڑے قانون دان ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے اس شعبے کے حوالے سے بہت کچھ دے رکھا ہے کاش وہ اپنا تھوڑا سا وقت اس انسانی کام کے لیے بھی دے سکیں۔ تاکہ آئندہ پولیس بے گناہ لوگوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا سکے۔ (دسمبر ۱۹۸۹ء)

## تصویر یا فوٹو جرائم کی تفتیش کا اہم ذریعہ ہے

اسلام کا مطلب سلامتی ہے اس لئے وہ معاشرے سے ہر قسم کے جرائم کا خاتمہ کر کے اسے پر امن بنانا چاہتا ہے۔ جرائم کے خاتمے کیلئے جو طریقہ بھی معاون ثابت ہو اسلام اس کی اجازت دے گا۔ موجودہ دور میں فوٹو یا تصویریں جرائم کی تفتیش کا اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ تمام عادی مجرموں کی تصاویر تفتیشی اداروں کے پاس محفوظ ہوتی ہیں۔ اور یہ ادارے ان تصاویر کے ذریعے جرائم کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ تصویر، علم پھیلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن چکا ہے، ہمارے بعض نیم تعلیم یافتہ علماء جن کی ہمارے معاشرے میں اکثریت ہے۔ اس کے حرام ہونے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس طرح حرام شراب سے بیماریوں کے علاج کیلئے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اسی طرح فوٹو یا تصاویر کے ذریعے علم حاصل کرنا، یا اسے کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک تو بڑے بڑے جید علماء جن میں بعض کو ان کے عقیدت مند اسلامی مفکر کے طور پر متعارف کراتے ہیں کا اس بارے میں یہی فتویٰ تھا۔ اس بارے میں جماعت اسلامی کے بانی سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا فتویٰ ان کی کتاب رسائل و مسائل جلد اول میں اب بھی موجود ہے۔ لیکن بعد میں زمانے کے تقاضوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اس بارے میں نرم رویہ اختیار کریں۔ چنانچہ

اخبارات میں ان کے فوٹوں کے مختلف پوز شائع ہونے لگے اور شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات نے تصاویر کو حرام قرار دینے والے فتوے واپس نہیں لئے اس لئے ابھی تک ان حضرات کے بعض عقیدت مند انہیں حرام قرار دیتے ہیں۔

حال ہی میں اسلامی ملک افغانستان میں ایسے لوگ برسرِ اقتدار آگئے ہیں جو قدامت پسند دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، ان حضرات نے سرکاری طور پر فوٹو کے حرام ہونے کا فتویٰ جاری کیا۔ ٹیلی ویژن جو آج تعلیم و تعلم کا بہت زیادہ موثر طریقہ بن چکا ہے اس پر پابندی لگا دی اور لوگوں کے گھروں سے انہیں اکٹھا کر کے سر راہے انہیں توڑ پھوڑ دیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے ایسے نیم تعلیم یافتہ علماء نے نہ صرف ٹیلی ویژن کو حرام قرار دے دیا ہے بلکہ وہ فوٹو اور تصاویر کے بارے میں بھی انہوں نے ایسا ہی رویہ اختیار کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان حضرات کا قرآن و حدیث کا مطالعہ بڑا ہی محدود ہے۔ اگر وہ اسلامی قانون کے ان بنیادی ذرائع کا غور سے مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شریعت اسلامی نے بتوں سے اس لئے منع کیا ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بتوں کی پرستش نہ کرنے لگ جائیں جہاں تک علمی مقاصد کیلئے تصویر کشی کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں اس کو واضح اجازت ملتی ہے جس کو تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔ احادیث نبوی میں تصاویر کے بارے میں جو روایات ملتی ہے ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کو بت پرستی سے روکا جائے۔

اب جبکہ وہ علماء حضرات، جو تصویر کشی کو حرام قرار دیتے رہے ہیں عملاً اسے جائز قرار دے چکے ہیں، ان سے توقع ہے کہ اس بارے میں اپنے پہلے فتاویٰ کو واپس لیکر لوگوں کو اس مفید ذریعہ علم سے محروم ہونے سے بچانے کی کوشش کریں۔ آئندہ صفحات میں اس بارے میں قرآن و حدیث سے جو تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ جرائم کی تفتیش اور علمی مقاصد کے لئے تصاویر کو شریعت اسلامی میں واضح اجازت ملتی ہے۔

## قرآن مجید میں تصاویر کا ذکر

قرآن مجید میں اسلام کے وہ تمام احکامات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جن پر عمل کرنا مسلمانوں کیلئے لازمی ہے۔ کچھ احکامات تو بالکل واضح الفاظ میں دیئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ سود حرام ہے شرک بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ ایسے معاملات ہیں کہ ان کے بارے میں واضح احکامات تو نہیں دیئے گئے لیکن ان کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ انہیں معاملات میں سے ایک تصاویر کا مسئلہ ہے۔ قرآن مجید میں تصاویر کا ذکر ہے۔ اور اس ذکر کے حوالے سے کچھ اہل علم انہیں جائز قرار دیتے ہیں جبکہ بعض انہیں ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں سورۃ سبأ میں ارشاد ربانی ہے:-

يَعْلَمُونَ لَهُ مَا لِيَشَاءَ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَاثِيلٍ - (سورۃ سبأ - ۱۳)

(ترجمہ) جنات! حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش کے مطابق ان کے لئے

مساجد اور تصاویر بنایا کرتے تھے۔

اس آیت میں جو لفظ محاریب ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی قلعے کے کئے ہیں جبکہ اکثریت نے اس سے مراد مساجد لی ہیں اور سباق و سباق کے لحاظ سے یہ معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس آیت میں جو دو سرا لفظ تماثیل آیا ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے مفسرین نے بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں ان تمام بحثوں کا

خلاصہ مشہور مفسر امام ابو عبد اللہ قرطبی نے اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن، جو تفسیر قرطبی کے نام سے مشہور ہے۔ میں بیان کیا ہے۔ اس لئے اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس خلاصہ کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ سورۃ سبأ کی اس آیت میں جو لفظ تماثیل استعمال ہوا ہے۔ وہ تماثیل کی جمع ہے اور اس سے مراد جاندار یا بے جان چیزوں کی تصاویر اور مجسمے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ تصاویر یا مجسمے عام طور پر شیشے۔ تانبے اور سنگ مرمر کے بنائے جاتے تھے۔ لیکن مجسمے زیادہ تر بے جان چیزوں کے بنائے جاتے تھے۔

بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے جو تصاویر یا مجسمے بنائے جاتے تھے وہ انبیاء علیہ السلام اور بڑے بڑے علمائے دین کی شبیہ ہوتی تھیں۔ ان تصاویر اور مجسموں کو مساجد میں نصب کیا جاتا تھا تاکہ لوگ ان نیک لوگوں کی تصاویر دیکھ کر زیادہ کوشش سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ کہ جب پہلی امتوں میں کوئی نیک آدمی وفات پاتا تھا۔ تو لوگ اس کے قبر پر مسجد بنا لیتے تھے۔ اور اس میں نیک لوگوں کی تصاویر بنایا کرتے تھے۔ تاکہ عبادت کرتے وقت انہیں یہ نیک بندے یاد آجائیں اور اس طرح عبادت میں زیادہ محنت کریں۔ اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس زمانے میں تصاویر اور مجسمے بنانے جائز تھے۔ لیکن بعد میں شریعت محمدی نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے۔ کہ تماثیل سے مراد جادو ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں کا مشغلہ تھا۔ اس جادو کے ذریعے وہ تصاویر بنانے والے لوگوں پر یہ پابندی لگا دیتے تھے کہ وہ فلاں جادو سے آگے نہ بڑھے۔ مثلاً وہ مکھی، مچھر اور مگرچھ کا مجسمہ بنا لیں اور لوگوں کو کہتے کہ ان میں سے کوئی بھی ان مجسموں سے آگے نہ بڑھے۔ چنانچہ جب تک یہ مجسمے ان جگہوں پر رہتے تو کوئی بھی ان سے آگے بڑھنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ (وہ ڈرتے تھے کہ یہ جادو کے مجسمے ہیں اگر

انہوں نے ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انہیں نقصان ہوگا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں جو لفظ تماشیل استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد انسانوں کے مجسمے ہیں جو تانبے سے بنائے جاتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انسانوں کے یہ مجسمے بنوا کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ ان میں روح پھونک دے۔ تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کر سکیں اور ان پر کوئی ہتھیار عمل نہ کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور پہلوان اسفندیار انہیں تانبے کے بنائے گئے انسانوں میں سے ایک تھا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ہی صحیح چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ ان جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ان کے تحت کے نیچے دو شیر بنا دیئے تھے اور اس کے اوپر دو گدھ بنا دیئے تھے۔ پس جب آپ تحت پر بیٹھتے تو وہ دونوں شیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اپنے بازو پھیلا دیتے اور جب آپ تحت پر بیٹھ جاتے تو گدھ اپنے پر آپ پر پھیلا دیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں تیسرا قول وہ ہے جو علامہ المکی نے اپنی کتاب الہدایۃ میں بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علماء کے ایک گروہ نے تصویر کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اس کے جائز ہونے کیلئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن ابن عطیہ نے اس قول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ ائمہ دین میں سے کسی نے تصویر کو جائز قرار دیا ہو۔

لیکن مفسر ابو عبد اللہ قرطبی جو تفسیر قرطبی کے مصنف ہیں فرماتے ہیں کہ تصویر کے جائز ہونے کے بارے میں علامہ المکی نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان سے پہلے امام الخاس بھی بیان کر چکے ہیں۔ کہ اس آیت کے حوالے سے علماء کی ایک جماعت نے تصویر بنانے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی واقعہ ہے کہ وہ تصاویر اور مجسمے بناتے تھے۔ لیکن ہمارے رسول اللہ صلعم سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے تصاویر بنانے سے منع کیا تھا۔ بلکہ تصویریں

بنانے والوں کو عذاب کی و عید سنائی تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تصویر بنانے کی اجازت کو منسوخ کر دیا۔ اور اس کی حکمت یہ تھی کہ جب رسول اللہ صلعم کو نبوت عطا کی گئی تو اس وقت تصاویر اور مجسموں کی عبادت کی جاتی تھی اور اس کا خاتمہ ضروری تھا۔

اس بارے میں چوتھا قول یہ ہے کہ تصاویر اور مجسمے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جاندار اشیاء کے اور دوسرے غیر جاندار اشیاء کے۔ پھر غیر جاندار اشیاء کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بالکل جامد ہیں دوسری جو جو بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہتی ہیں۔ اور جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ان سب چیزوں کو تصاویر اور مجسمے بنایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس آیت میں جو لفظ تماشیل آیا ہے۔ وہ عام ہے اور سب چیزوں کو احاطہ کرتا ہے اور اسرائیلی روایات جو بعض مسلمان مفسروں نے اختیار کر لی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان کے تخت پر پرندوں کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ اگر کہا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تصاویر بنانے کی اجازت کیسے دی تھی۔ حالانکہ یہ شریعت محمدی میں منع ہیں تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ تصاویر بنانا حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا بعد میں شریعت محمد نے اسے منسوخ کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ ہی صحیح بات کو جانتے ہیں اور ابن العالیثہ سے روایت ہے کہ پہلے شریعتوں میں تصویریں بنانا حرام نہیں تھا۔

اس بارے میں پانچواں قول یہ ہے کہ اگر احادیث نبوی کو دیکھا جائے تو وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تصاویر شریعت اسلامی میں ممنوع ہیں۔ سوائے ان تصاویر کے کہ کپڑوں پر بنائی گئی ہوں۔ تو ان تصاویر کو دوسری تصاویر سے علیحدہ سمجھا گیا۔ پھر کپڑوں پر تصاویر کے بارے میں بھی آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا جب آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس کپڑے کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے کیونکہ جب بھی میری نظر اس کپڑے پر پڑتی ہے تو مجھے دنیا یاد آجاتی ہے۔ پھر جس کپڑے سے آپ نے منع کیا تھا تو اسے پھاڑ کر اس کے تکیے بنا دیئے گئے۔

اس طرح اس تصویر والے کپڑے کی شکل بدل گئی۔ اور تکیے میں اس تصویر والے کپڑے کی شکل اس طرح بدل جائے کہ اس میں تصویر کی پوری شکل باقی نہ رہے۔ اگر اس کی پوری شکل باقی رہیگی تو پھر بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور اس کے حرام ہونے کا ثبوت یہ ہے۔ کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کیلئے ایک تصاویر والا تکیہ خریدا تاکہ آپ اس پر بیٹھیں اور ٹیک لگائیں۔ تو آپ نے اس سے منع فرمایا بلکہ اسے مستحق عذاب قرار دیا۔ اور ایک حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ایسے کپڑے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جس میں تصاویر تھیں۔ تو اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ شروع میں ایسا کرنا جائز تھا۔ لیکن بعد میں یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔ اور اس کے بعد سے لیکر آج تک تصاویر کو ناجائز سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی صحیح بات کو جانتے ہیں یہ ابن العربی مالکی نے بیان کیا ہے۔

اس بارے میں چھٹا قول یہ ہے جو امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے گھر میں ایک پردہ تھا جس پر پرندوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ جب کوئی ہمارے گھر آنے والا آتا۔ تو سب سے پہلے اس کی نظر اس پردے پر پڑتی تھی۔ تو ایک دن رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس پردے کو ہٹادو۔ کیونکہ جب بھی گھر میں داخل ہوتے وقت میری نظر اس پر پڑتی ہے تو مجھے دنیا یاد آجاتی ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ان کی ایک مخملی چادر تھی۔ جس پر ریشم کے نشان تھے تو ہم اس چادر کو پہنا کرتے تھے۔ اور ان سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جب رسول اللہ صلعم تشریف لائے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے باریک پردے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ جس پر تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ تو اس سے آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر آپ نے پردہ پکڑ کر اسے پھاڑ دیا۔ پھر فرمایا کہ قیامت کے دن ان لوگوں کو سخت عذاب دیا جائے گا جو چیزوں کی تصاویر بنا کر اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت سے مشابہت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک ایسا کپڑا تھا کہ جس میں گھر کے برآمدے تک تصاویر بنی



ہوں تھیں۔ رسول اللہ صلعم جب نماز پڑھا کرتے تھے تو وہ کپڑا آپ کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ تو ایک دن آپ نے فرمایا کہ اس کپڑے کو سامنے سے ہٹالو۔ پس میں نے وہ کپڑا وہاں سے ہٹا دیا اور اس کے دو تکیے بنائے۔ بعض ائمہ نے ان احادیث کی روشنی میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو تصاویر والا پردہ پھاڑا تھا یا اپنے سامنے سے ہٹوا دیا تھا تو یہ عمل تقویٰ پر مبنی تھا۔ کیونکہ نبوت اور رسالت میں تو تقویٰ کی بلندی ہوتی ہے۔ جس کا آپ نے خیال کیا۔ ویسے یہ معاملہ حرام نہیں تھا۔ اس لئے اس معاملے کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ صلعم سے تصاویر کی جو ناپسندیدگی روایت کی جاتی ہے۔ تو وہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ تصاویر حرام تھیں۔ بلکہ آپ چونکہ تقویٰ کی بلندیوں پر تھے اس لئے ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے۔

اس بارے میں ساتواں قوال یہ ہے کہ جو علامہ المزنی نے امام شافعی سے نقل کیا ہے۔ کہ اگر کسی آدمی کو شادی میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ اور وہاں پر کسی ایک ذی روح کی تصویر ہو یا ایسی بہت سی تصاویر ہوں۔ تو اگر یہ تصاویر دیواروں پر لگی ہوئی ہوں تو اسے اس گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر وہ تصاویر نیچے زمین پر پڑی ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں۔ اور اگر یہ تصاویر درختوں کی ہوں تو بھی ان کا یہی حکم ہے۔ اس بارے میں فقہاء کا اتفاق ہے۔ کہ جو تصاویر پردوں پر رقم ہوں اور یہ پردے لٹکے ہوئے ہوں تو یہ حرام تو نہیں لیکن ناپسندیدہ ضرور ہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک عمارتوں میں نقش کردہ تصاویر بھی حرام ہیں۔ ہاں بعض کے نزدیک کپڑوں پر بنائی گئی تصاویر جائز ہیں اور اس کیلئے وہ سہل بن حنیف سے روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ سوائے ان تصاویر کے جو کپڑوں پر نقش ہوں۔

مصنف فرماتے ہیں کہ احادیث کے مطابق رسول اللہ صلعم نے تصویریں بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور اس لعنت سے کسی خاص قسم کی تصویریں بنانے والے بومستثنیٰ نہیں یا اس بارے میں آپ کا ارشاد یہ ہے۔ کہ ان تصویروں کے

بنانے والوں کو قیامت کے دن سخت عذاب دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا تھا۔ انہیں زندہ کرو۔ اور آپ نے اس حدیث میں کسی مصور کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا تھا۔ اور صحیح ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن دوزخ سے آگ کا ایک ٹکڑا نکلے گا۔ جس کی دو آنکھیں ہوں تو جس سے وہ دیکھ سکے گا اور دو کان ہونگے جن سے وہ سن سکے گا اور ایک زبان ہوگی جس سے وہ بول سکے گا۔ اور کہے گا کہ تین قسم کے لوگوں کی سرکوبی اسے سوچی گئی ہے پہلا گروہ سرکش لوگوں کا دوسرے وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو تصاویر بناتے ہیں۔ سنن ترمذی کے جامع امام ابو عیسیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ غریب ہے لیکن حسن اور صحیح ہے۔ اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد بیان کیا گیا ہے۔ کہ قیامت کے دن تصویر بنانے والوں کو سب سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا۔ تو یہ ارشاد نبوی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ہر قسم کی تصویر بنانا ناجائز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ تم اس کے درخت کو پیدا نہیں کر سکتے۔

اس بارے میں آٹھواں قول یہ ہے کہ بچوں اور بچیوں کے کھلونے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے سات سال کی عمر میں ان سے شادی کی اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی۔ اور وہ رخصتی کے ساتھ اپنے کھلونے بھی ساتھ لائی تھی اور جب رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی تو آپ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اور ان سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلعم کے پاس دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتی تھی اور میری سلیاں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ اور جب رسول اللہ صلعم گھر میں داخل ہوا کرتے تھے۔ تو وہ کمرے میں ہر پردوں کے پیچھے چھپ جایا کرتی تھیں۔ آپ انہیں میرے پاس بھیج دیتے اور وہ میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ اس حدیث کو صحیح مسلم میں روایت کیا گیا ہے۔

۱۔ اسلام نے کہا ہے کہ بچیوں کے لئے کھلونوں اور گڑیوں کا جواز ضرورت کے لئے ہے اور بچیوں کو اس کی خاص ضرورت ہے کہ اولاد کی تربیت کے لئے ان گڑیوں کے ذریعے انہیں سکھایا جائے۔ پھر یہ بات بھی ہے۔ کہ ان گڑیوں کی کوئی مستقل نوعیت نہیں۔ اس لئے جو تصاویر مٹھائی سے کھانے کیلئے بنائی جائیں وہ جائز ہیں اور اسی طرح آٹے وغیرہ سے بنائی جانے والی تصاویر کا حکم ہے کہ وہ دیرپا نہیں ہوتیں تو ان کے بارے میں شریعت اسلامی میں رخصت دی گئی۔ اور اصل حقیقت کو اللہ تعالیٰ وہی بہتر جانتے ہیں۔

(تفسیر الجامع الاحکام القرآن از امام قرطبی جلد چودھویں ۶۷۲ تا ۶۷۵)

قرآن مجید کی سورۃ سب میں جن تصاویر کا ذکر ہے اس کے بارے میں علمائے اسلام کا نقطہ نظر خود ان کی زبانی تفصیل سے پیش کر دیا گیا ہے۔ جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

۱۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے تصاویر اور مجسمے بنوایا کرتے تھے۔

۲۔ یہ مجسمے انبیاء علیہ السلام اور نیک لوگوں کے ہوتے تھے جنہیں مساجد میں نصب کیا جاتا تھا۔ تاکہ عام لوگوں میں عبادت کا شوق پیدا ہو۔

۳۔ اس آیت کی روشنی میں تصاویر اور مجسموں کے جائز ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مسلمان ائمہ کی ایک جماعت اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے تصاویر کو جائز قرار دیتی ہے۔

۴۔ تاہم جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ یہ تصاویر اور مجسمے بنانا حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں تو جائز تھا۔ لیکن شریعت محمدی میں اس اجازت کو منسوخ کر دیا گیا۔

۵۔ قرآن کے حکم کو قرآن مجید کا دوسرا حکم ہی منسوخ کر سکتا ہے۔ لیکن اس منسوخی کیلئے احادیث نبوی سے استدلال کیا جاتا ہے۔

تصویر کی شرعی حیثیت کے بارے میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں اور جن میں سے کچھ اوپر والی تفسیر میں بھی نقل ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں تو آئندہ باب میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ یہاں ہم قرآن مجید کی روشنی میں تصویر کی شرعی حقیقت کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی طرف ایک ہی شریعت نازل فرمائی اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کی زبان کہلوا یا گیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ لا نفرق بین احد من رسلہ (سورۃ البقرہ۔ ۴۰) ترجمہ۔ ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق تفریق نہیں کرتے۔ ایسا ہی ارشاد سورۃ بقرہ کی آیت ۱۶ اور سورۃ آل عمران کی آیت میں بھی ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ جن کے جدا مسجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس شریعت کی تعلیم دی۔ مسلمانوں کیلئے وہ شریعت سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شریعت میں تماثیل کو جائز بھی قرار دیا گیا ہے اور حرام بھی قرار دیا گیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ کب وہ جائز ہوگی اور کب ناجائز ہوگی۔ جب ان سے تعلیمی فائدہ حاصل کیا جائے گا تو قرآن مجید کے مطابق یہ جائز ہوگی۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام اسی مقصد کیلئے جنوں سے یہ تصاویر بنوایا کرتے تھے۔ ہاں اگر انہیں عبادت کی غرض سے بنایا جائے گا تو یہ حرام ہوگی۔ اور اس کی وضاحت بھی خود قرآن مجید میں ہی کر دی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور ان کی قوم ان تماثیل کو پوجا کرتے تھے۔ تو اس بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے یہ سوال کیا۔

ماہذہ التماثیل التي انتم لها عاكفون (سورۃ الانبیاء۔ ۵۲)

(ترجمہ) ان تماثیل کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم لوگ جے بیٹھے ہو۔

علامہ قرطبی نے اس آیت میں تمثال کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کے مشابہ بنائی گئی ہو۔ (جامع احکام القرآن از علامہ قرطبی جلد گیارہ ۲۹۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگے چل کر خود ان تماثیل کی وضاحت کر دی ہے۔ آپ نے اپنی قوم کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

والله لا كيدن اصنامكم - سورة الانبياء - ۵۷

(ترجمہ) اللہ کی قسم میں تمہارے ان اصنام یعنی بتوں کے ساتھ ایک چال

چلوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تماثیل کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا اس پر اگر غور کیا جائے تو اس سے تصاویر کی شرعی حیثیت کے بارے میں کچھ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اگر مجسمے یا مورتیوں یا تصاویر کے سامنے رہنا یا ہونا، حرام، ناجائز اور غلط ہوتا تو حضرت ابراہیم اپنی قوم کے لوگوں کو کہہ سکتے تھے کہ تم لوگ ان تماثیل کے سامنے نہ بیٹھا کرو۔ مگر آپ نے یہ نہ فرمایا بلکہ ان کی قوم کے لوگ جن تماثیل کے سامنے بیٹھے اور جھکے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ان لوگوں کا تصور جاننے کیلئے ان سے پوچھا کہ یہ کیسی تماثیل ہیں جن کے سامنے تم جم کر بیٹھے رہتے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں نے آپ کے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس سے ان کا وہ تصور واضح ہو جاتا ہے جو تماثیل کے بارے میں انہوں نے قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے ان تماثیل کی عبادت کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی ان کی پیروی میں ایسا کر رہے ہیں تو ان کے اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ صرف تماثیل کا نہیں تھا۔ بلکہ ان تماثیل کے بارے میں ان کے غلط تصور کا معاملہ تھا۔ وہ لوگ ان تماثیل کی عبادت کیلئے ان کے سامنے بیٹھے رہتے تھے۔ چونکہ یہ تصور باطل تھا۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے اعلان فرمایا دیا:-

لقد كنتم انتم و اباؤكم في ضلل بعد (سورة الانبياء)

(ترجمہ) البتہ تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی سب کے سب صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ اس سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعتراض تماثیل پر نہ تھا بلکہ اس تصور پر تھا جو ان کی قوم ان تماثیل کے بارے میں رکھتی تھی۔ کہ یہ تماثیل ان کی حاجات کو پورا کرتی ہیں اور انہیں نفع و نقصان پہنچاتی ہیں۔ یہ غیبی امور سے باخبر ہیں صاحب اختیار ہیں حیات و موت کی ضامن اس لئے عبادت کے لائق ہیں۔ چنانچہ جب آپ نے ان کے اس تصور کو غلط قرار دیا تو ان لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اور انہوں نے حضرت ابراہیم کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اجثتنا بالحق ام انت من الاعیین۔ (سورہ الانبیاء)

(ترجمہ) کیا جو بات تم کہہ رہے ہو واقعی سچ ہے (اور تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہے ہو) یا مذاق کر رہے ہو۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے اس غلط تصور کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے اور جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔

لیکن آپ کی اس وضاحت سے آپ کی قوم کی تسلی نہ ہوئی اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں یہ دکھانے کیلئے کہ یہ تماثیل جن کو لوگ خدائی طاقتوں کا مالک، عبادت کے لائق، اپنا نجات دہندہ اور نفع و نقصان کا مالک سمجھتے تھے۔ وہ خود اس قدر مجبور، بے بس اور ناچار ہیں کہ نہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنے قاتلوں کا پتا نشان بتا سکتی ہیں۔ ایک دن موقع پا کر انہیں توڑ پھوڑ دیا۔ اور اس طرح قوم کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ ان تماثیل کے بارے میں ان کا تصور غلط ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام کے جد امجد تھے۔ انہوں نے بھی اپنی قوم کے سامنے وہی دین پیش کیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ لیکن اس دین کو لوگوں تک پہنچانے انہوں نے اپنی تماثیل سے دعوت میں کام لیا۔ مفسرین کی زبانی اس کی تفصیلات سابقہ صفحات میں گزر چکی ہیں کہ ان

تماثل کے ذریعے وہ اپنی قوم کو زیادہ عبادت کی رغبت دلاتے تھے۔ تماثل کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس متضاد طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہیں خدائی اختیار کا مالک سمجھ کر ان کی پرستش کی جائے گی تو یہ حرام ہوگی لیکن اگر یہ دعوت دین کے کام میں مدد ثابت ہوں تو پھر ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی فرق کو سامنے رکھتے ہوئے علمائے اسلام کی ایک جماعت نے تصاویر کو جائز قرار دیا تھا۔ لیکن جمہور علماء نے اس جواز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب مناسب تو یہ تھا کہ وہ قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دینے کیلئے قرآن مجید سے ہی کوئی دلیل دیتے۔ لیکن اس مقصد کیلئے انہوں نے کچھ احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ جن پر اگلے باب میں گفتگو کی جائے گی۔



## احادیث اور حرمت تصاویر کے بارے میں فقہاء کا

### مسئلہ

قرآن مجید میں جس طرح تمثیل کا ذکر ہوا ہے اس کے حوالہ سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ شریعت اسلامی میں تصاویر کا جواز ثابت ہوتا ہے اور امام قرطبی کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمان علماء کی ایک جماعت نے قرآن مجید کو ان آیات سے تصاویر کے جواز کے بارے میں استدلال کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تصاویر پہلے امتوں میں جائز تھیں جنہیں شریعت محمدی نے منسوخ کر دیا۔ حالانکہ قرآن مجید میں تصاویر کی حلت و حرمت کے بارے میں جو اشارات ملتے ہیں ان کا تعلق دین ابراہیمی سے ہے اور شریعت اسلامیہ کو بھی دین ابراہیمی ہی کی ایک کڑی سمجھا جاتا ہے اس بارے میں احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے اور ان کی روشنی میں فقہانے جو مسلک اختیار کیا ہے اس کی تفصیلات آئندہ سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

### فوٹو کی شرعی حیثیت

اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج تصویر اور



منسوری کے سخت خلاف ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں فوٹو کو محرمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ درحقیقت حرمت کا یہ تصور اس لئے قائم ہو گیا ہے کہ فوٹو اور مجسمہ یابت کے درمیان ائمہ مجتہدین نے جو امتیاز قائم کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ احادیث اور فقہ سے جن تصاویر کی حرمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مجسم یعنی جسم والی تصاویر ہیں مثلاً مجسمہ یابت وغیرہ۔ دوسری تصاویر جن کا سایہ نہ ہو تو اکثر ائمہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔

وقال بعض السلف انما ينهى عما كان له ظل - ولا باس بالصور  
التي ليس لها ظل -

ترجمہ:- بعض سلف صالحین فرماتے ہیں کہ صرف وہی تصویر ممنوع ہے جس کا سایہ ہو اور جس تصویر کا کوئی سایہ وغیرہ نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ تمام فقہی مذاہب نے تصویر کے سلسلے میں اسی اصول کو مد نظر رکھا ہے حنفی مسلک بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

تصویر حنفی فقہ میں

قالوا تصوير غير الحيوان من شجره و نحوه جائز - اما تصوير  
الحيوان فان كان على بساط او وسادة او ثوب مفروش او ورز  
فانه جائز - لان الصورة في هذه الحالات تكون ممتهنته  
وكذلك ويجوز اذا كانت الصورة ناقصه عضوا لا يمكن ان  
تعيش بدونه كالراس و نحوه - (الفقه على المذاهب الاربعه جلد ۲، صفحہ

(۵۲)

غیر جاندار اشیاء مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر جائز ہے۔ اور اگر جاندار اشیاء کی تصاویر، چٹائی، تکیہ درمی یا کاغذ وغیرہ پر ہوں تو جائز ہیں۔ کیونکہ ان حالتوں میں تصویر کے احترام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ایسی تصاویر جن میں کا کوئی ایسا عضو نہ ہو

جس کے بغیر جاندار زندہ نہ رہ سکتا ہو مثلاً سر وغیرہ تو ایسی تصویر بھی جائز ہے۔  
اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حنفی مسلک میں کانڈ پر تصویر  
کی اجازت ہے۔ کیونکہ اس میں تصویر کے احترام کی کوئی صورت نہیں۔

### تصاویر اور احادیث

صحیح احادیث سے بھی اس مسلک کی گنجائش ملتی ہے۔ بلکہ جس حدیث شریف  
کو تصویر کی حرمت کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے، اسی حدیث کو اگر مکمل نقل کیا  
جائے تو اس سے جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔ یہ وہ مشہور حدیث ہے کہ۔  
لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ صورۃ تصویر والے گھر میں فرشتے داخل نہیں  
ہوتے۔

ہم تکمیل فائدہ کے لئے یہ حدیث بخاری شریف سے پوری کی پوری نقل  
کرتے ہیں۔

عن بسر بن سعید ان زید بن خالد الجہنی حدثہ ومع  
بسر بن سعید عبید اللہ الخولانی، الذی کان فی حجر میمونۃ  
رضی اللہ عنہا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثہما  
زید بن خالد ان ابا طلحۃ حدثہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم  
قال۔ لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ صورۃ۔ قال بسر فمرض زید بن  
خالد فعدناہ فاذا نحن فی بیتہ بستر فیہ تصاویر۔ فقلت بعبید  
الحوالی۔ الم یحدثنا فی التصاویر؟ فقال: الا رقم فی ثوب  
الاسمعتہ؟ قلت لا، قال: بلی، قد ذکرہ۔

حضرت بسر بن سعید سے مروی ہے کہ زید بن خالد الجہنی نے ان سے یہ حدیث بیان  
کی اور بسر بن سعید کے ساتھ عبید اللہ الخولانی بھی تھے، جنہوں نے ام المومنین حضرت  
میمونہ کی گود میں روڑش پائی تھی۔ زید بن خالد نے کہا کہ ان سے ابو طلحہ نے

بیان فرمایا کہ رسولِ رم صلعم نے فرمایا کہ جس گھر میں تصاویر ہوتی ہیں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ بسر فرماتے ہیں کہ زید بن خالد بیمار ہوئے تو ہم ان کی عیادت کو گئے۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ خود ان کے گھر میں ایک پردہ پر تصاویر ہیں تو میں نے عبید خولانی سے کہا کہ انہوں نے تو ہمیں حرمت تصویر کے متعلق حدیث بیان کی تھی۔ جواب ملا کہ کیا تم نے نہیں سنا کہ کپڑے کی تصاویر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں انہوں نے اس کا ذکر کیا تھا۔

یہ حدیث صراحت کے ساتھ کپڑے پر منقوش تصاویر کو جائز ٹھہراتی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ نے شاید اسی حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے کاغذ کو کپڑے پر قیاس کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کاغذ کی تصویر میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث سے ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے اس حسن ذوق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ گھروں کو تصاویر سے سجاتے تھے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب تصاویر والے کپڑوں کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور کپڑوں کی بعض قسمیں ان تصاویر کی وجہ سے مشہور تھیں۔ مثلاً جس کپڑے پر پرندوں کی تصاویر ہوئیں انہیں ”مطیر“ کہتے تھے جن پر گھوڑوں کی تصاویر ہوتیں انہیں ”محل“ اور جن پر اونٹوں اور کجاووں کی تصاویر ہوتیں انہیں ”مرحل“ کہتے تھے۔ ایک صحیح حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ خود رسول اللہ صلعم بھی ایسے کپڑے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ حدیث جامع الترمذی صحیح مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں بایں الفاظ موجود ہے:

عن عائشہ رضی اللہ عنہا قالت: خرج النبی صلی اللہ

علیہ وسلم ذات غداة وعلیہ مرط مرحل من شعر اسود

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلعم نکلے تو وہ کالی اون

کی ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھے جس پر تصاویر تھیں۔

(رواہ احمد و مسلم و الترمذی و صححہ نیل الاوطار جلد ۴)

علامہ شوکانی ”مرط مرحل“ کے یہ معنی بتاتے ہیں۔

ہی برد فیہ تصاویر و تلک التصاویر ہی صور الرحال (۵)  
یہ تصاویر والی چادر تھی۔ اور یہ تصاویر اونٹوں کے کجاووں کی تھیں۔

اس حدیث سے رسول اللہ صلعم کے ذوق کی نفاست کا بھی پتہ چلتا ہے کہ  
آپ منقش کپڑوں کو بھی پسند فرماتے تھے۔ جن پر تصاویر ہوتیں۔ حالانکہ اس زمانے  
میں تصاویر ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سادہ کپڑوں کی نسبت ان تصاویر  
والے کپڑوں کی قیمت کئی گنا زیادہ ہوتی ہوگی۔

علامہ شوکانی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تصویر کا شرعی حکم بھی بیان  
فرماتے ہیں۔

واما اتخاذ مافیہ صورة حیوان فان کان معلقا علی حائط  
او ثوبا او عمامتہ اونحو ذلک مما یعد ممتہنا فهو حرام.....  
وقال آخرون یجوز منها ما کان رقما فی ثوب سواء ممتہن ام  
لا۔ علق فی حائط ام لا۔ قال هو مذهب القاسم بن محمد و  
اجمعوا علی منع ما کان له ظل (ایضاً صفحہ ۱۰۵)

جاندار کی تصویر اگر دیوار پر لٹکی ہوئی ہو یا کپڑے یا پگڑی وغیرہ پر نقش ہو تو  
جائز ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا احترام ممکن نہیں ہے۔ کچھ ائمہ کے نزدیک  
کپڑے کی تصویر مطلقاً جائز ہے۔ اس کے لئے اہانت یا دیوار پر ہونے کی شرط  
ضروری نہیں۔ یہ قاسم بن محمد کا مذہب ہے۔ تاہم ایسی تصویر کی حرمت پر اجماع  
ہے جس کا سایہ ہو (یعنی مجسمہ یا بت)

جس تصویر کا سایہ نہ ہو اس کا حکم ہم شروع میں ہی بیان کر آئے ہیں۔ جس  
کے جواز کی گنجائش تمام فقہی مذاہب میں موجود ہے۔ یعنی جب تصویر کپڑے یا کاغذ  
پر ہوگی تو اس کا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس لئے جائز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصاویر اگر حرام عین ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت سلیمان علیہ السلام کبھی ان کے بنوانے کی خواہش نہ فرماتے۔

ويعملون له مايشاء من محاريب و تماثيل (القرآن - سبأ ۲۰)  
جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے محاریب اور تماثيل جو وہ چاہتے تھے بناتے تھے۔

اس کی تاویل یوں کی جاتی ہے کہ تصاویر حضرت سلیمان کی شریعت میں جائز تھیں بعد میں حرام قرار دے دی گئیں۔ تاہم اس کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کی جاتی۔ آخر حضرت سلیمان بھی تو دین ابراہیمی کے ہی تابع تھے۔

### تصویر اور محراب مسجد

اس آیت میں تماثيل کے ساتھ محاریب کا ذکر بھی آیا ہے۔ اور جہاں تماثيل کی حرمت بیان کی جاتی ہے وہیں کچھ سلف صالحین نے محراب کو بھی ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں جو مورتیاں بنائی جاتی تھیں۔ وہ انہی محاریب میں رکھی جاتی تھیں۔ علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

وتكره المحاريب في المساجد۔ وقال علي اما المحاريب  
فمحدثه۔ وانما كان رسول الله صلعم يقف وحده ويصف  
الصف الاول خلفه (المحلی جلد ۲، صفحہ ۲۳۹)

مساجد میں محرابیں بنانا مکروہ ہے۔ یہ دور رسالت کے بعد کی چیزیں ہیں۔ رسول اللہ صلعم اکیلے کھڑے ہوتے اور ان کے پیچھے پہلی صف بنتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی خیال تھا۔

عن علي بن ابی طالب انه كان يكره المحراب في المسجد  
وعن سفیان الثوری عن منصور بن المعتمر عن ابراهيم النخعی  
انه كان يكره ان یصلی فی طاق الامام۔ قال سفیان و نحن

نکرہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں محراب ناپسند فرماتے تھے۔ (ایضاً)  
سفیان ثوری منصور بن المعتمر سے اور وہ ابراہیم النخعی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ  
محراب میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسے مکروہ ہی  
سمجھتے ہیں۔ (ایضاً)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ تو اس سے بھی سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں:

وعن کعب یكون فی آخر الزمان تنقص اعمارهم یزینون  
مساجدهم ویخذون لها مذابح کمذابح النصارى۔ فاذا فعلوا  
ذلک صب علیهم البلاء وهو قول محمد بن جریر الطبری  
وغیرہ۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آخری زمانے میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کی عمریں  
کم ہوں گی۔ وہ مسجدوں کو خوب خوب سجائیں گے اور اس میں نصاریٰ کی طرح  
قربان گاہیں بنائیں گے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ان پر افتاد پڑے گی اور محمد بن جریر  
طبری کا بھی یہی مذہب ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۰)

ائمہ کی ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں محراب بنانا تصاویر  
سے بھی زیادہ ناپسندیہ کام ہے۔ کیونکہ محراب بنانے پر جو وعید بتائی گئی، وہ تصویر کی  
بابت کہیں بیان نہیں ہوئی تاہم اس ناپسندیدگی کے باوجود مساجد، محرابوں سے مزین  
ہیں اور فوٹو کے سلسلے میں تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک حرمت تصویر کی شرائط

تصویر کے متعلق امام مالک کا مذہب اور بھی واضح اور مفصل ہے۔ ان کے  
نزدیک جاندار کی تصویر کی حرمت کے لئے چار شرائط کا پایا جانا لازمی ہے۔ اگر ان میں  
سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو تصویر جائز ہوگی۔

## شرط اول:

احدها ان تكون الصورة لحيوان سواء كان عاقلا او غير عاقل  
 حرمت تصوير کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کسی عاقل یا غیر عاقل جاندار کی ہو۔ (الفقه علی  
 المذاهب الاربعہ جلد ۲، صفحہ ۵۰)

## شرط دوم

ان تكون مسجدة دوسری شرط یہ ہے کہ وہ تصویر جسم رکھتی ہو۔ (ایضاً)۔  
 تاہم بعض مالکیہ کے نزدیک ایسی مجسم تصاویر بھی جائز ہیں جو غیر دریا مادہ سے  
 بنائی گئی ہوں۔

وقال بعضهم اذا صنعت من مادة لا تبقى فانها تجوز  
 بعض نے کہا کہ اگر یہ کسی ایسے مادہ سے بنائی گئی ہوں جو باقی رہنے والا نہ ہو، تو جائز  
 ہے (ایضاً)

اور اگر یہ تصاویر جسم نہ رکھتی ہوں تو پھر جائز ہیں۔

اما اذا لم تكن مجسدة كصور الحيوان والانسان التي ترسم  
 على الورق والثياب والخيطان والسقف ونحو ذلك ففيها  
 خلافه بعضهم يقول انها مباحته مطلقا بلا تفصيل و بعضهم  
 يقول انها مباحته اذا كانت على الثياب التي تستعمل فرشاً۔  
 اگر حیوان یا انسان کی تصاویر جسم والی نہ ہوں۔ جیسا کہ کسی کاغذ، کپڑے یا چھت یا  
 دیوار وغیرہ پر ہوں، تو اس میں اختلاف ہے۔ بعض مالکیہ کے نزدیک تو یہ مطلقاً جائز  
 ہے۔ بعض صرف اسی صورت میں ان کے جواز کے قائل ہیں جبکہ وہ فرش استعمال  
 کے لئے ہوں۔ (ایضاً)

## شرط سوم

مالکیہ کے نزدیک حرمت کی تیسری شرط یہ ہے کہ وہ تصویر تب ہی حرام

ہوگی۔ جب کہ وہ مکمل اعضا والی ہو۔

ثالثہا ان تكون كاملته الاعضاء الظاهرة التي لا يمكن ان يعيش  
الحيوان اولا نسان يدونها فان ثقت بطنها اوراسها او غير  
ذلك فانها لا تحرم

تیسری شرط یہ ہے کہ تصویر کے تمام ایسے ظاہری اعضا مکمل ہوں، جن کے بغیر انسان  
یا حیوان کا جینا ممکن نہ ہو۔ مثلاً اس کا پیٹ یا سر وغیرہ اڑا دیا جائے تو ایسی تصویر حرام  
ہوگی۔ (ایضاً)

### شرط چہارم

چوتھی شرط یہ ہے کہ اس تصویر کا سایہ ہو۔

رابعها ان يكون لها ظل فان كانت مجسدة ولكن لا ظل لها۔  
بان بنيت في الحائط ولم يظهر منها سوى شبي لا ظل له فانها  
لا تحرم (۱۶)

حرمت کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ اس کا سایہ ہو۔ اور اگر تصویر جسم والی ہے  
لیکن اس کا سایہ نہیں مثلاً دیوار میں اس طرح بنائی گئی ہو کہ اس میں سے اس کا  
صرف ایسا حصہ نظر آئے جس کا سایہ نہ ہو تو اس صورت میں بھی تصویر حرام نہ  
ہوگی۔ (ایضاً)

دوسری شرائط نہ بھی ہوں تو صرف یہی چوتھی شرط ہی فوٹو کے جواز کے لئے  
کافی ہے۔ یہ صرف مالکیہ ہی کا مسلک نہیں بلکہ اور بھی بہت سے ائمہ مجتہدین یہی  
رائے رکھتے ہیں اور ان حضرات کا مسلک ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ  
تعلیم و تربیت کے لئے جسم والی تصاویر بھی جائز ہیں۔

ويستثنى من ذلك كله لعب البنات الصغار (العرائس)  
الصغيرة الذی۔ يجوز تصويرها وبيعها ولو كانت مجسدة



لان الغرض منها انما هو تدريب البنات و تعليم هن و من هذا تعلم ان الغرض من التحريم انما هو القضاء على ما يشبه الوثنيه في جميع الاحوال (ايضاً)

بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے گڑیاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ چاہے وہ تصاویر مجسم ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ مقصد تو بچیوں کی تربیت کرنا ہے۔ اس اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جاننا چاہیے کہ حرمت کا مقصد بت پرستی کے شالے کو ختم کرنا ہے۔ (ایضاً)

حنابلہ

حنابلہ کا بھی تقریباً یہی مسلک ہے کہ اگر تصویر مکمل الاعضاء نہ ہو تو جائز ہے۔ فاذا كان مسجداً ولكن ازيل منه ما لا تبقى معه الحياة كالراس ونحوها فانه مباح (ايضاً صفحہ ۵۲)

اگر تصویر مجسم ہو لیکن اس عضو کے بغیر ہو جس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا مثلاً سر وغیرہ تو یہ جائز ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۲)

یعنی ان کے نزدیک کم از کم آدھے جسم کا فوٹو تو جائز ہوا۔

شافعیہ

شافعیہ کا بھی تقریباً تقریباً یہی مسلک ہے۔ وان كان مسجداً فانه يحل التفرج عليه اذا كان على هيئة لا يعیش بها كان مقطوع الراس او الوسط او ببطنه ثقب (ايضاً)

اگر تصویر مجسم (جسم والی) ہے تو اس کی نمائش اس صورت میں جائز ہے جب وہ اس حالت میں ہو کہ جس میں زندہ رہنا ممکن نہ ہو مثلاً اس کا سر کٹا ہوا ہو یا درمیان سے کٹی ہوئی ہو یا اس کا پیٹ کٹا پھٹا ہو۔ (ایضاً)

تاہم وہ اس سے پردہ فلم کے عکس کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

ومن هذا يعلم جواز التفرج على خيال الظل اذا لم يشتمل على

محرم اخر لانها صورة ناقصته (ايضاً)

اس اصول کے تحت فلم کی نمائش بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں کوئی اور حرام چیز نہ ہو کیونکہ پردہ پر ناقص صورت ہی پڑتی ہے۔ (ایضاً)

حدیث شریف 'مذاہب اربعہ اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال سے 'جو ہم نے پیش کئے ہیں۔ اگر کسی تصویر کی حرمت پر اجماع ہے تو وہ ایسی تصویر ہے جس کا سایہ ہو اور اگر اس کا سایہ نہ ہو تو وہ جائز ہے اور چونکہ فوٹو کا بھی کوئی سایہ وغیرہ نہیں ہے اس لئے وہ بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔

ان تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ تصاویر اگر حرام ہیں تو وہ صرف بت پرستی کی وجہ سے ہیں اور جب یہ امکان نہ ہو تو پھر ان کے جائز ہونے میں کوئی روکاوٹ نہیں، انہیں علمی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور جرائم کی تفتیش میں تھی ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔



## خفیہ تفتیشی اداروں کی اصلاح کی ضرورت

اخباری اطلاعات کے مطابق ملک کے سب سے بڑے خفیہ تحقیق کے ادارے آئی۔ ایس۔ آئی کا سیاست دانوں کی نگرانی کا شعبہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ شعبہ ان اطلاعات کے بموجب جنرل ضیاء الحق نے سیاست دانوں کے مشاغل کی نگرانی کے لئے قائم کیا تھا جب کہ موجودہ حکومت اس قسم کی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ حکومت کے اس اقدام سے عام لوگوں نے جنہیں ان اداروں کا خوشگوار یا تلخ تجربہ ہے ان اداروں کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنی شروع کر دی ہیں تاکہ ان حساس اداروں کی خامیوں کو دور کر کے۔ ان سے ملک و قوم کی خدمت کا کام بہتر طور پر لیا جاسکے۔ راقم کا بھی ان اداروں کے ساتھ ایک دلچسپ تجربہ ہوا تھا۔ جس کی روشنی میں ان اداروں کو مزید موثر بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تجربے کی کچھ تفصیلات سامنے لائی جائیں اگرچہ ان اداروں کی جانب سے راقم کا بلاوجہ تعاقب کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود راقم کا یہ پختہ یقین ہے کہ یہ ادارے ملک و قوم کی سیکورٹی کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ملک دشمن عناصر کی کارروائیوں پر نظر رکھی جاسکے اور ان کے مذموم مقاصد کا بروقت تدارک کیا جاسکے۔

پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے کہ راقم نے برادر اسلامی لیبیا کے نئے نظام کے بارے میں سلسلہ مضامین لکھا میرے مضامین کو جمہوریہ لیبیا کے سفیر نے بھی پسند کیا اور جب وہ لاہور تشریف لائے تو بندہ کو بھی ملاقات کا شرف بخشا اور لیبیا کے دورے کی دعوت بھی دی ان کی تشریف آوری کے چند دنوں کے بعد لاہور میں امریکی کونسلٹ کے ایک افسر اعلیٰ جناب پرائیس بھی مجھے ملنے آئے۔ ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ لاہور میں امریکہ کے نائب کونسل جنرل ہیں۔ راقم حیران تھا کہ جسے اپنے محلے کے لوگ نہیں جانتے۔ اسے اتنے بڑے امریکی سفارت کار نے ملاقات کا شرف کیوں بخشا انہوں نے فرمایا کہ وہ بس ملنے آئے ہیں اور اسلامی علوم سے دلچسپی ہے اس لئے وہ سود کے مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان آتے وقت انہیں جو فائل دی گئی تھی۔ اس میں راقم کے بھی کچھ مضامین تھے۔ راقم انہیں اپنے چیئرمین صاحب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی خدمت میں لے گیا اور ان کے سامنے بعض اسلامی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ بعد میں انہوں نے دو تین دفعہ مجھے کھانے کی دعوت پر بھی بلایا لیبیا کے دورے کی جو دعوت مجھے دی گئی تھی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اسے قبول نہ کیا جائے۔ اس لئے راقم نے اس بارے میں لیبیا کے سفارت خانے کو اطلاع دے دی۔ تاہم ان دونوں راقم دو تین دن سفارت خانے میں گیا۔ دو دفعہ ایک دوست کی کار میں اور تیسری دفعہ پیدل جب میں کار میں سوار ہو کر گیا تو مجھ سے کسی نے کوئی پوچھ گچھ نہ کی لیکن جب پیدل گیا تو واپسی پر خفیہ تفتیشی اداروں کے اہلکاروں نے مجھے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات پوچھے۔ یہی نہیں بلکہ راقم کے آبائی گھر اور جہاں جہاں ملازمت کی تھی۔ وہاں ان اداروں کی جانب سے تحقیق کی گئی۔ راقم کا تعلق میانوالی کے علاقے سے ہے۔ اور خاندان کے لوگ زیادہ تر قدامت پسند اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اس تفتیش سے کافی گھبرائے اور مجھے ڈانٹا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید میں نے کوئی جرم کیا ہے۔

اسی دوران تفتیشی ادارے کا ایک اہلکار میرے دفتر آیا۔ راقم نے اسے لیبیا

کی حکومت کے دعوت نامے کی ایک نقل مہیا کی ہے اور ساتھ ہی پوچھا کہ آپ لوگوں نے لیبیا کے سفارتخانے میں میرے پیدل جانے کا نوٹس لیا ہے۔ لیکن دو تین دفعہ کار پر گیا تھا تو کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا حالانکہ جس غلط کام کا آپ کو خدشہ تھا۔ وہ غریب لوگ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر محب وطن ہوتے ہیں بڑے لوگ ہی ایسا کرتے ہیں۔ جن کے پاس پہلے بھی دولت کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اس ہکے باوجود اس دولت کی لالچ میں وہ ملک و ملت کے خلاف کام کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے میرے اس ذاتی واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حکومت کو کسی غلط قسم کا خطرہ تھا تو ظاہر ہے کہ اس کا خطرہ ان لوگوں سے ہو سکتا تھا جو کاروں میں سوار ہو کر آتے ہیں نہ کر پیدل دھکے کھانے والوں سے لیکن ان لوگوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا۔ صرف غریب لوگوں کو دھر لیا جاتا ہے۔ کیا ان کا یہ قصور ہے کہ وہ سفارتخانے میں کاروں میں بیٹھ کر نہیں آتے!

مجھے یقین ہے کہ میرے لیبیا کے دورے سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں اچھے دور کا آغاز ہو سکتا کیوں کہ ہمارے سیاسی لیڈر اس برادر اسلامی ملک کا دورہ کرنے کے بعد محض ایک بیان دینے پر اکتفا کرتے ہیں اور وہاں پر جو سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں ان کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ تبدیلیاں ہمارے لئے کئی شعبوں میں رہنمائی مہیا کرتی ہیں اور راقم ان تبدیلیوں کے بارے میں اہل وطن کو ایک سلسلہ مضامین کی صورت میں تفصیل سے آگاہ کرتا رہا ہے تفتیشی ادارے کے اسی اہلکار سے راقم نے امریکی سفارت کار کے آنے کا ذکر کیا۔ اور ان سے پوچھا کہ تفتیشی اداروں نے اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا۔ بلکہ بعض لوگوں نے مجھے یہاں تک بتایا کہ ان کا تعلق امریکہ کے خفیہ تفتیش کے ادارے سے تھا لیکن اس بارے میں وہ کوئی وضاحت نہ کر سکا۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے اس بارے میں راقم نے ان کے افسر اعلیٰ کا نام معلوم کیا اور قومی جذبے کے تحت انہیں یہ ساری تفصیلات لکھ بھیجیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے صحیح

پتہ نہیں بتایا گیا تھا۔ وگرنہ افسر اعلیٰ میرے خط کا ضرور جواب دیتے اور اس بارے میں میرے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔

اب جب کہ حکومت نے ان تفتیشی اداروں کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا ہے تو راقم نے اپنا یہ ذاتی تجربہ ان اداروں کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ راقم کو امید ہے کہ ملک و ملت کی سیکورٹی کے ان حساس اداروں کی اصلاح کے لئے اس حقیر کے ذاتی معاملے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ (مارچ ۱۹۸۵ء)



## نفاذ اسلام مالی فوائد اور پولیس

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام اس دعوے کے ساتھ عمل میں لایا گیا تھا کہ ملک عزیز میں اسلامی نظام نافذ کرے گا۔ اس اتحاد کو سارے ملک میں تو اقتدار نہ مل سکا۔ لیکن صوبہ پنجاب میں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ چنانچہ اتحاد کے لیڈروں سے بجا طور پر یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اگر وہ اپنے اسلام کے دعوؤں میں مخلص تھے تو صرف پنجاب میں ہی اسلامی نظام نافذ کر دیتے لیکن اسلامی نظام نافذ کرنا تو کجا الٹا ایسے معاملات کی حوصلہ افزائی کی گئی جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھے۔

اسلامی جمہوری اتحاد میں ملک کی تمام دینی جماعتیں شامل ہیں۔ اس کے سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد صاحب ہیں۔ وہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے کبھی کبھی اس سلسلے میں بیان جاری کر دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ اعتراضات جمعیت علمائے اسلام کے لیڈر قاضی سمیع الحق کو سننے پڑے جو اسلامی جمہوری اتحاد کے نائب صدر بھی ہیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ سے غفلت برتنے میں ان کو جس قسم کے اعتراضات سننے پڑے ان کی وجہ سے انہیں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے پنجاب حکومت کے خلاف بیان بازی شروع کر دی کہ وہ اسلامی نظام کے سلسلے میں مخلص نہیں۔ ان سے کہا گیا کہ

اگر وہ دیانتداری سے سمجھتے ہیں کہ پنجاب کی حکومت اسلامی نظام کے سلسلے میں مخلص نہیں تو پھر انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی نائب صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس عہدے کی وجہ سے تو قاضی صاحب کے بیانات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد سے استعفیے دینے کے بعد ان کے بیانات کا شائع ہونا تو کجا۔ انہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اس لئے استعفیے دینے کی بجائے انہوں نے اعتراض کرنے والے علماء سے وعدہ کیا کہ وہ ان سب کو ایک وفد کی صورت میں اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر کے پاس لے کر جائیں گے اور ان سے اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں عملی قدم اٹھانے کا مطالبہ کریں گے۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق چند دن پہلے اس وفد نے قاضی سمیع الحق صاحب کی قیادت میں وزیر اعلیٰ پنجاب سے اس سلسلے میں ملاقات کی۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے ان کی معروضات کو غور سے سنا اور فرمایا کہ اسلامی نظام کا نفاذ وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے کام کی ابتداء کر دی ہے۔ اس سال نئے سال کے شروع ہونے پر انہوں نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ صوبے میں نئے سال کی کوئی ایسی تقریب منعقد نہ ہونے پائے جس میں راگ رنگ کا عنصر شامل ہو۔ اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچے طبقے پر مشتمل عالیشان حلقوں میں اس کے باوجود یہ راگ و رنگ کی محفلیں منعقد ہوئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی ظاہر کرنے کے لئے بعض ایسے گھرانے کے لوگوں کا چالان کر لیا جو کسی دوسری وجہ سے خوشی کی تقریبات منا رہے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کی مذکورہ کارروائیوں کے بعد اسلام کا صحیح معنوں میں نفاذ ممکن رہ جاتا ہے۔ ہماری حیرت کا سبب یہ ہے کہ علماء حضرات کا وفد یہ بات سن کر مطمئن ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس ملک میں اسلام پولیس کے ذریعے نافذ ہوگا۔ تادم تحریر وزیر اعلیٰ کے اس بیان کے خلاف ان کا کوئی اختلافی بیان شائع نہیں ہوا۔

رسول اللہ صلعم نے جب دنیا میں اسلامی نظام نافذ کیا تو اس مقصد کے لئے



پہلے معاشرے کو تیار کیا اور مساوات پر مبنی اسلام معاشرہ قائم کیا۔ اس معاشرے میں کسی انسان کو کسی دوسرے بھائی کی محنت کے استحصال کی اجازت نہ تھی۔ اسی مقصد کے لئے سود کو حرام قرار دیا گیا۔ علماء حضرات کے وفد سے توقع تھی کہ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ کی توجہ اسلامی نظام کے ان بنیادی اصولوں کی طرف دلاتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ پنجاب بنک کو بلا سود بنکاری کا ادارہ بنایا جائے لیکن انہوں نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی انہوں نے کوئی ایسا دوسرا مطالبہ کیا کہ جس کے نتیجے میں یہاں حقیقی اسلامی معاشرہ قائم ہو سکے جو اسلام کے مساوات کے اصول پر مبنی ہو۔ اسی پنجاب میں چند لوگ ایسے ہیں جو ارب پتی ہیں۔ جبکہ کروڑوں انسانوں کو دو وقت کی پوری روٹی بھی میسر نہیں ایسی صورت میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی حدود کے نفاذ کو معطل کر دیا تھا۔

جبکہ اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر پولیس کے ذریعے اس معاشرے میں اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں امیر طبقہ بڑی بے دردی سے غریب لوگوں کو استحصال کر رہا ہے اور جن کے ہاں دولت کے بل بوتے پر جشن کی راتیں منائی جاتی ہیں۔ پولیس جس طرح اس ملک میں اسلامی نظام نافذ کر رہی ہے۔ اتفاق سے اسی معاشرے میں ایک طرف علماء کا یہ وفد اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ سے ملاقات کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف پولیس حدود آرڈیننس کے نام پر شریف شہریوں کو تنگ کر رہی ہوتی ہے۔

ایسے واقعات رونما ہونے کے باوجود کسی عالم دین نے اس بارے میں اپنے خدشے کا اظہار نہ کیا کہ پولیس کے ذریعے اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل میں اسلامی نظام کے سلسلے میں کوئی بھی مخلص نہیں جماعت اسلامی پچھلے چالیس سال سے اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرتی آرہی ہے لیکن ابھی تک اس نے قابل عمل اسلامی نظام کا کوئی نقشہ عوام کے سامنے پیش نہیں کیا۔ بلکہ پچھلے گیارہ سال میں اس نے مارشل لاء جو اسلامی نظام کا ضد ہے، کی یوں کھل کر تائید کی کہ وہ مارشل لاء کی

بی نیم کے طور پر مشہور ہو گئی۔

خود قاضی سمیع الحق صاحب نائب صدر اسلامی جمہوری اتحاد بھی اسلامی نظام کے سلسلے میں مخلص نہیں۔ (ان کا ایک رسالہ ”الحق“ کے نام سے اکوڑہ خٹک سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں تمباکو فروش کمپنیوں کے اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جب تمباکو نوشی کا اسلامی ممالک میں رواج ہوا تو دنیا کے تمام علماء نے اس کے حرام ہونے کا متفقہ فتویٰ دیا تھا۔ آج تمباکو فروش کمپنیاں علماء حضرات کا منہ بند کرنے کے لئے ان کے رسائل میں بڑے بڑے اشتہارات شائع کراتی ہیں جو عملاً رشوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ قاضی سمیع الحق صاحب کے نوٹس میں یہ بات لائی گئی اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے ماہنامے میں سگریٹ نوشی کے اشتہارات شائع کرنے بند کر دیں خاص طور پر اب جبکہ یورپ کہ جس نے تحفہ مسلمان ممالک کو دیا تھا میں بھی اس کیخلاف مہم چلی ہوئی ہے لیکن لوگوں کے اس مطالبے کے باوجود قاضی صاحب اس تھوڑے سے مالی فائدے کو جو حرام آمدنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ چھوڑنے پر تیار نہیں، تو انہیں اسلام نظام کے قیام کے سلسلے میں کیسے مخلص سمجھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پولیس کے ذریعے اسلام نافذ کرنے کا عین اسلام سمجھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ حضرات اسلام کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے اس کے نفاذ میں دلچسپی لیں اور اس مقصد کے مساوات پر مبنی اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کر دیں۔ (جنوری ۱۹۹۰ء)



## انسانی معاشرے میں امن قائم کرنے کے اسلامی اصول

اقوام متحدہ کی جانب سے اس سال ۲۰ ستمبر کو بین الاقوامی یوم امن منانے کا اعلان کیا گیا ہے اس بارے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۹۸۱ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال نومبر کے تیسرے منگل وار کے دن کو یہ تقریب منائی جائے گی۔ اس تقریب کے منانے سے تمام دنیا کے انسانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ اقوام متحدہ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے ہر دم کوشاں ہے۔

جنگ اور امن ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے اس اہم مسئلہ نے ہر دور کے انسانوں کو پریشان کئے رکھا چنانچہ ہر دور میں مصلحین نے اس دنیا سے جنگ کا وجود ختم کر کے امن قائم کرنے کی سعی کیں۔ اب بھی یہ کوششیں کسی نہ کسی شکل میں جاری ہیں۔ اقوام متحدہ کا قیام بھی اسی سمت میں ایک مثبت کوشش ہے لیکن ابھی تک یہ کوششیں بار آور نہیں ہو سکیں اور دنیا میں پائیدار امن قائم نہیں ہو سکا۔

موجودہ دور میں امن قائم کرنے کا یہ اصول مقبول ہو چکا ہے کہ ہر ملک زیادہ سے زیادہ مہلک ہتھیار جمع کر لے تاکہ اس اسلحہ کے خوف کی وجہ سے دوسرا ملک اس پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ لیکن ایک دفعہ اسلحہ کی یہ دوڑ شروع ہو جائے تو پھر ختم

ہونے میں نہیں آتی۔ بلکہ جب بڑی طاقتوں کے اسلحہ خانے، اسلحہ سے بھر جاتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں لڑائی چھیڑ دیتے ہیں۔ اس لئے آج بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کہیں لڑائی شروع ہو اس کے پیچھے بڑے بڑے اسلحہ ساز ممالک کے ہاتھ ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اسلحہ کی دوڑ سے امن قائم نہ ہو سکا، تو اب یہی قومیں اس بات پر رصا مند ہو گئی ہیں کہ اس کی تعداد کو محدود کر دیا جائے اس طرح امن کی طرف مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔

بعث نبوی سے پہلے ملک عرب، شروفساد کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہاں لڑائی چھڑ جاتی تھی جس سے سارے ملک کا امن تباہ ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بد امنی کو ختم کرنے کے لیے ایسے مثبت اقدامات اٹھائے کہ ملک عرب سے شروفساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا پھر جب تک مسلمان ان اصولوں پر عمل کرتے رہے یہ دنیا امن کا گوارہ بنی رہی۔ لیکن جب مسلمان ان اصولوں سے غافل ہو گئے تو پھر خود وہ فساد کے لپیٹ میں آ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سنگین مسئلے کو بالکل ایک دوسرے طریقے سے ختم کیا۔ آپ ﷺ نے اس مقصد کے لئے نہ تو کوئی بڑی فوج تیار کی اور نہ ہی اسلحہ کے انبار لگائے۔ بلکہ اعلان فرمایا کہ اس دنیا سے استحصال کا خاتمہ کر دیا جائے تو ہر طرف خود بخود امن و امان قائم ہو جائے گا دنیا میں زیادہ تر جنگیں، اسی استحصال کا نتیجہ تھیں استحصال کو شرعی اصطلاح میں ربوا کہا جاتا ہے۔ جس کا سادہ سا معنی سود کیا جاتا ہے حالانکہ یہ ایک بہت ہی وسیع اصطلاح ہے اور اس میں استحصال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔ خود قرآن مجید نے اسے جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ تم میں سے جو ربوا چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ (سورۃ البقرہ

(۲۷۹۰)

اس ارشاد ربانی سے معلوم ہوتا ہے کہ سود شریعت اسلامی میں نہ صرف یہ

کہ سنگین جرم ہے بلکہ اس کے نتیجے میں انسانیت کو جنگوں کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب سود کے حرام ہونے کے احکامات نازل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اپنے زمانے کے تمام کاروباری معاملات کی چھان بین کی اور سود اور تجارت کے فرق کو واضح کر کے سودی معاملات کی نشاندہی فرمائی روایات میں آتا ہے کہ سود کی حرمت کے احکام نازل ہوتے ہی آپ ﷺ منڈیوں اور کھیتوں میں تشریف لے گئے۔ ایک کھیت میں آپ کی ملاقات ایک صحابی حضرت رافع بن خدیج سے ہوئی جو ایک کھیت کو پانی دے رہے تھے، آپ ﷺ نے ان سے کاشت کے معاملے کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔ جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ مالک زمین کوئی دوسرا ہے اور حضرت رافع اس کی زمین پر کاشت کاری کر رہے ہیں اور فصل کے تیار ہونے پر آدھی فصل مالک زمین کے حوالے کریں گے تو آپ نے اس معاملے کو خالص سودی قرار دیا اور حضرت رافع کو اسے ختم کرنے کی ہدایت کی۔

(سنن ابوداؤد جلد دوم ۲۶۱ باب مخبرہ)

ایک دوسرے صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ نے جب اس بارے میں مزید وضاحت حاصل کرنے کی خواہش کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کی بٹائی کے کاشت کاری والے معاملے کے حرام ہونے کے لئے ٹھیک ٹھیک وہی الفاظ استعمال فرمائے جو قرآن مجید میں سود کے حرام ہونے کے بارے میں نازل ہو چکے تھے۔ (ایضاً)

آپ نے صحابہ کو تلقین فرمائی کہ ہر کوئی محنت کر کے کھائے کوئی کسی دوسرے کی محنت ناجائز طریقے سے حاصل نہ کرے اگر کسی صحابی کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ زمین ہے تو وہ اپنے ضرورت مند بھائی کو مفت دے دے۔

ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹ کا کاروبار بھی۔ سود ہی کی تعریف میں آتا ہے کیونکہ اس کاروبار کے ذریعے بغیر کسی نقصان کے خطرے کے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ نے صحابہ کرام کو اس قسم کے کاروبار

سے سختی سے منع کر دیا تھا اور جب کبھی اس قسم کے کاروبار کا کوئی واقعہ آپ کے علم میں آتا تھا۔ تو آپ پر اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ (نیل الاوطار جلد پنجم ۲۳۴)

کاروبار کی ایک بدترین قسم سٹہ بازی کی ہے اس کاروبار میں مال تجارت اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے اور سٹہ باز اس کے نرخ بڑھا چڑھا کر ایک دوسرے سے خرید کے سودے کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی یہ کاروبار اپنے پورے عروج پر ہے اس کاروبار میں صرف رقم ہاتھ بدلتی ہے۔ مال تجارت وہیں کا وہیں پڑا رہتا ہے اور ہاتھ بدلنے کے ساتھ مہنگا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی سود کی ایک قسم قرار دے کر اسلامی معاشرے کے اس برائی سے پاک کر دیا۔ اہل مکہ اور عرب میں آباد یہودی اسی قسم کے استحصالی کاروبار کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ان اقدامات سے وہ مشتعل ہو گئے تھے اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگیں لڑنے پر مجبور کیا اگرچہ یہ لوگ ہر قسم کے جدید اسلحے سے پوری طرح لیس تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ کی کئی کے باوجود انہیں شکست پر شکست دی اور اس طرح اس دنیا سے استحصال قوتوں کا خاتمہ کر دیا۔ آج مسلمان خود سود کو جائز قرار دے کر استحصالی قوت بن چکے ہیں تو اس حالت میں اسلامی معاشرہ کو کس طرح پر امن بنا سکتے ہیں اسلامی اور انسانی معاشرے کو امن کا گوارہ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ دنیا سے استحصال ختم کیا جائے۔ (ستمبر ۱۹۸۸ء)

☆☆☆☆☆

چوتھا حصہ

اسلامی شرعی حدود

۱  
۲  
۳  
۴  
۵  
۶  
۷  
۸  
۹  
۱۰  
۱۱  
۱۲  
۱۳  
۱۴  
۱۵  
۱۶  
۱۷  
۱۸  
۱۹  
۲۰  
۲۱  
۲۲  
۲۳  
۲۴  
۲۵  
۲۶  
۲۷  
۲۸  
۲۹  
۳۰  
۳۱  
۳۲  
۳۳  
۳۴  
۳۵  
۳۶  
۳۷  
۳۸  
۳۹  
۴۰  
۴۱  
۴۲  
۴۳  
۴۴  
۴۵  
۴۶  
۴۷  
۴۸  
۴۹  
۵۰  
۵۱  
۵۲  
۵۳  
۵۴  
۵۵  
۵۶  
۵۷  
۵۸  
۵۹  
۶۰  
۶۱  
۶۲  
۶۳  
۶۴  
۶۵  
۶۶  
۶۷  
۶۸  
۶۹  
۷۰  
۷۱  
۷۲  
۷۳  
۷۴  
۷۵  
۷۶  
۷۷  
۷۸  
۷۹  
۸۰  
۸۱  
۸۲  
۸۳  
۸۴  
۸۵  
۸۶  
۸۷  
۸۸  
۸۹  
۹۰  
۹۱  
۹۲  
۹۳  
۹۴  
۹۵  
۹۶  
۹۷  
۹۸  
۹۹  
۱۰۰



## شرعی حدود کا فقہی تصور

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تجارت اور کامیابی کے لئے قرآن حکیم میں دو قسم کے احکام نازل فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم تو اخلاقی احکامات پر مشتمل ہیں۔ یعنی ان کا ارتکاب بھی اگرچہ ہر حالت میں معیوب ہے اور اس جرم کے برے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی خلاف ورزی پر شریعت اسلامی کی طرف سے کسی قسم کی تعزیری سزا مقرر نہیں کی گئی۔ جیسے تکبر سے چلنا، دوسرے مسلمان بھائی کی ہنسی اڑانا وغیرہ۔

دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کے ارتکاب پر شریعت کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے۔ قانون کی اصطلاح میں انہیں تعزیری احکام کہا جاتا ہے اور فقہ میں انہیں شرعی حدود کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے چوری کا ارتکاب، زنا کاری اور شراب خوری وغیرہ، قرآن حکیم نے انہیں جرم قرار دے کر ان کی باقاعدہ سزا مقرر فرمائی ہے۔

قرآن حکیم میں ان جرائم کے متعلق مطلق حکم فرما دیا گیا ہے۔ ان کی مختلف شکلوں کا تعین نہیں کیا گیا۔ مثلاً شراب خوری کو جرم تو قرار دے دیا گیا لیکن ان تفصیلات کے تعین کا کام اسلامی حکومت کے لئے چھوڑ دیا گیا کہ کس قسم کی شراب

حرام قرار دی جائے گی اور اس کی کتنی مقدار پینے سے کوئی انسان مجرم ہو گا یا اس میں کوئی استثناء کی صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یا مثلاً چوری کے ارتکاب کی سزا قطعید فرمادی گئی ہے لیکن یہ کہ کتنی مالیت کی چوری پر یہ حد نافذ ہوگی اور کس قسم کی چوری جرم قرار پائے گی تو جرائم کی ان شکلوں کے تعین کا کام اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دے دیا گیا۔ احادیث کی روشنی میں بھی کچھ صورتوں کا تعین ہوتا ہے لیکن زیادہ تفصیل اور باقاعدگی سے یہ کام ہمارے فقہائے کرام نے سرانجام دیا۔ چنانچہ اس زمانے میں ان جرائم کے فیصلے ان کی مقرر کردہ شکلوں کے مطابق ہوتے تھے۔ اور ابھی تک ایسے فیصلوں کے لئے انہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نئے زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہیں۔

فقہ اسلامی کی تدوین جدید کے متعلق آج کل بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی صاحب علم نے اس موضوع کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ آیا زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان تعزیری جرائم کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کے تعین کی تدوین جدید کی بھی ضرورت ہے یا نہیں؟۔ اس سلسلے میں ان کی خاموشی سے تو یہی متباور ہوتا ہے وہ شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور جو کچھ فقہائے کرام اس موضوع پر دوسری یا تیسری صدی تک کام کر چکے ہیں اسی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن جس طرح بار بار اسلامی حدود کا نام لیا جا رہا ہے۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فقہائے کرام کی متعین کردہ مخصوص شکلیں خود ان کے ذہن میں بھی نہیں ہیں۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر یہ اشد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند مشہور جرائم کی وہ مخصوص شکلیں جو فقہائے کرام نے متعین فرمائی ہیں ایک ترتیب سے پیش کر دی جائیں تاکہ جن حضرات کو اس موضوع سے کچھ دلچسپی ہو۔ ان کی کچھ رہنمائی ہو سکے۔

پاکستان میں حنفی فقہ کی مقبولیت اور رواج کے پیش نظر ہم اپنی اس کوشش کو صرف حنفی فقہ تک ہی محدود رکھیں گے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ پیش نظر مقصد کے

لئے مندرجہ ذیل مشہور جرائم کی متعین کردہ مخصوص شکلیں کفایت کریں گی۔

(۱) شراب خوری اور اس کی سزا۔

(۲) سرقہ یعنی چوری کا ارتکاب۔

(۳) پردہ کی حدود۔

(۴) جرم زنا کاری کی حد۔

(۵) زنا کاری کے ثبوت کے لئے شہادت۔

## حرمت شراب

شراب کو حرام قرار دینے کے لئے فقہاء نے کچھ قیود عائد کی ہیں۔ جن کی عدم موجودگی میں حرمت کا حکم نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ قیود پوری تفصیل کے ساتھ حنفی فقہ کی معتبر ترین کتاب ہدایہ شریف سے نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) ونبيد العسل والتين و نبيذ الحنطه والذرة والشعير حلال وان لم يطبخ وهذا عند ابي حنيفة و ابي يوسف رحمهما الله اذا كان من غير لهُو و طرب لقوله عليه السلام الخمر من هاتين الشجرتين و اشار الى الكرمته والنخلته خص التحريم بها۔  
هدايہ اخريں مصطفىائى صفحہ ۲۸۱ (كتاب الاشر بته) يا تكملته شرح فتح القدير مصرى جلد ۸ صفحہ ۱۶۱۔

(ترجمہ) شہد، انجیر، گندم، باجرہ اور جو کی نبید حلال ہے، چاہے وہ پکائی بھی نہ گئی ہو اور یہ مسلک امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال لہو و لعب کے لئے نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ شراب صرف ان دو درختوں سے بنتی ہے۔ اور آپ نے انگور اور کھجور کی طرف اشارہ کیا اور حرمت کا حکم ان دونوں کے ساتھ مخصوص کیا۔

(۲) و هو نص على ان ما يتخذ من الحنطه والشعير والعسل

والذرة حلال عندابی حنیفہ ولا تحرم شاربہ عندہ وان سکرمنہ۔

(ترجمہ) اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شراب گندم، جو، شہد اور باجرا سے بنائی جائے وہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حلال ہی اور اس کے پینے والے پر کوئی حد نہ ہوگی چاہے وہ اسے مست ہی کیوں نہ کر دے۔ (ایضاً)

(۳) ولا باس بالخلیطین لما روی عن ابن زیاد انه قال سقانی ابن عمر شربته ما کدی اهدی الی اہلی۔

(ترجمہ) اور خلیطین (ایک قسم کی شراب جو کھجور اور انگور کے عرق کو ملا کر بنائی جاتی ہے) کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ ابن زیاد سے روایت کی گئی ہے کہ ابن عمر نے مجھے ایسا مشروب پلایا کہ میں نشہ کی وجہ سے گھر کا راستہ نہ پاسکتا تھا۔ (ایضاً)

(۴) وعصیر العنب اذا طبخ حتی ذهب ثلثاه وبقی ثلثہ حلال وان اشتد۔

(ترجمہ) اور انگوروں کا رس اس طرح پکایا جائے کہ دو تہائی خشک ہو جائے تو ایسا مشروب بھی حلال ہے چاہے وہ کتنے نشہ والا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

(۵) واذا تخللت الخمر حلت سواء صارت خلا بنفسیتا او بشی یطرح فیہا ولا یکرہ تخلیساھا۔ (ایضاً)

(ترجمہ) جب نمبیز کو سرکہ میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے چاہے وہ خود بخود سرکہ بن جائے یا اس میں کوئی چیز ڈال کر اسے سرکہ میں تبدیل کیا جائے اور نمبیز سے سرکہ بنانے میں کوئی قباحت نہیں۔

شرابی کی سزا

شرابی پر حد جاری کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط عائد کی گئی ہیں۔

(۱) فان اقرا بعد ذهاب رائتھالم یحد عندابی حنیفہ وابی یوسف۔

(ترجمہ) اگر شرابی شراب کی بو ختم ہونے کے بعد اپنے جرم کا اقرار کرے۔ تو اس پر کوئی حد نہیں۔ ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۵۰۰ یا شرح فتح القدر جلد ۴ صفحہ ۱۷۹۔

(۲) ولا حد علی من وجد منه رائحہ الخمر (ایضاً)  
(ترجمہ) ایسا شخص جس کے منہ سے شرابی کی بو آرہی ہو (لیکن گواہ نہ ہوں) تو اس پر بھی کوئی حد نہیں۔

(۳) ومن اقرب شوب الخمر و السكر ثم رجع لم یحد (ایضاً)  
(ترجمہ) اگر کوئی شخص شراب اور نشہ کا اقرار کرنے کے بعد اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس پر کوئی حد نہیں۔

(۴) والسكران الذی یحد لا یعقل منطقاً لا قلیلاً ولا کثیراً ولا یعقل الرجل من المراه۔

(ترجمہ) صرف ایسے شرابی پر حد جاری کی جائے گی جو تھوڑا یا زیادہ کوئی کلام نہیں سمجھ سکتا اور نہ مرد عورت میں پہچان کر سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۰۳)

(۵) ولا یحد السكران باقرار علی نفسه لزیادۃ احمال الکذب فی اقرارہ فتسال لدرہ

(ترجمہ) اگر کوئی نشہ میں دست شخص اپنے شراب پینے کا اقرار کرے تو اس پر بھی حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کے اس طرح اقرار کرنے میں جھوٹ کا بہت زیادہ احتمال ہے اس لئے بچاؤ کے لئے حیلہ کیا جائے گا۔ (ایضاً)

سرقہ یعنی چوری کے ارتکاب کی سزا

ہمارے ہاں چوری کی شرعی سزا کے متعلق بڑی لمبی چوڑی نظری بحثیں چلتی رہتی ہیں لیکن فقہاء کی متعین کردہ شکلوں کی طرف کسی نے کبھی دھیان نہیں دیا۔

جن چیزوں کی چوری پر قطع ید لازم نہیں آتا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ یہ تفصیلات ہدایہ شریف کی ایک کتاب۔ کتاب السرقتہ اور باب ما یقطع فیہ ولا یقطع فیہ پر مبنی ہیں۔

(۱) ولا قطع فیما یوجد تافها مباحا فی دار الاسلام کا الخشب والحشیش والقصب و السمک والطیر (وفی الطیر الدجاج والبط والحمام) والصيد والزرنیخ والمغرة والنورة۔ (ترجمہ) دارالاسلام میں جو چیزیں کم قیمت اور عام ہوں۔ مثلاً خشک لکڑی، گھاس، بانس، مچھلی اور پرندے (اور پرندوں میں مرغ، بطخ اور کبوتر بھی شامل ہیں اور شکار اور ہڑتال اور عمدہ مٹی اور چونا کی چوری کے مرتکب کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ (شرح فتح القدر جلد ۴ صفحہ ۲۲۶)

(۲) ولا قطع فیما تسارع الیہ الفساد کا اللبن واللحم والفواکته الرطبتہ

(ترجمہ) ایسی چیزیں جو جلدی خراب ہو جاتی ہیں مثلاً دودھ، گوشت اور تازہ میوے ان کی چوری پر بھی قطع ید لازم نہیں آتا۔ (ایضاً)

(۳) ولا قطع فی الفاکھتہ علی الشجر والزرع الذی لم یحصد

(ترجمہ) اور درختوں پر لٹکے ہوئے میوے اور ایسی کھیتی کی جو ابھی کاٹی نہ گئی ہو، چوری پر بھی چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے۔ (ایضاً)

(۴) ولا یقطع فی الا شربتہ المطربتہ

(ترجمہ) سرور انگیز اور مست کر دینے والے مشروبوں کی چوری پر بھی مواخذہ نہیں۔ (ایضاً)

(۵) ولا قطع علی سارق الصبی الحروان کان علیہ حلی۔

(ترجمہ) آزاد بچہ چاہے اس پر زیور ہی کیوں نہ ہوں اس کے چرانے والے پر

کوئی قطع ید نہیں۔ (ایضاً)

(۶) ولا قطع فی الدفاتر کلھا۔

(ترجمہ) رجسٹر، کاغذات اور کتابوں وغیرہ کی چوری پر بھی قطع ید نہیں۔ (ایضاً)

(۷) ولا فی سرقتہ کلب ولا فھر

(ترجمہ) کتے اور چیتے کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ (ایضاً)

(۸) ولا قطع فی دف ولا طبل ولا بربط ولا مزمار

(ترجمہ) آلات موسیقی کی چوری پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً)

(۹) ولا قطع علی خائن ولا خائنتہ

(ترجمہ) خائن مرد اور عورت پر حد لازم نہیں آتی۔ ولا منتھب ولا

مختلس لیٹرے اور چھین کر بھاگ جانے والے چوروں کے بھی ہاتھ نہیں کٹیں

گے۔ (ایضاً صفحہ ۵۱۵)

(۱۰) ولا یقطع السارق من بیت المال لانہ مال العامتہ۔

(ترجمہ) بیت المال سے چوری کرنے والے چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں

گے کیونکہ وہ عوام کی مشترکہ ملکیت ہے۔ (ایضاً)

(۱۱) ولا من مال للسارق فیہ شرکتہ۔

(ترجمہ) اگر کسی کے مال میں چور کی شراکت ہے تو اس کی چوری پر بھی قطع

ید نہیں (ایضاً)

(۱۲) ومن لہ علی آخود راہم فسرق مثلھا لم یقطع۔

(ترجمہ) کسی شخص نے اگر کسی سے قرض لینا ہے اور اس نے اس کے مال کی

چوری کر لی ہے تو اس پر کوئی حد نہیں۔ (ایضاً)

(۱۳) ومن سرق من ابویہ او والبدہ او ذی رحم مخرم منہ لم

یقطع۔

(ترجمہ) جس نے والدین یا بیٹے یا دوسرے رشتہ داروں کی چوری کی اس پر

قطع ید نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۱۶)

(۱۳) ولا قطع علی من سرق مالا من حمام اذمن بیت اذن للناس فی دخوله فیہ کوجود الاذن عارۃ وید خل فی ذلک حوانیت التجارۃ والخافات الا اذا سرق منها البلا لا نہا بینت للا حراز اموال الناس وانما الاذن تختص بالنهار۔

(ترجمہ) جس شخص نے حمام یا ایسی جگہ سے جہاں جانے کی عام اجازت ہے اور ایسے مکانات میں تجارتی دوکانیں اور سزائیں شامل ہیں، مال چوری کیا تو اس پر قطع ید نہیں، ہاں اگر اس نے ان جگہوں پر رات کے وقت چوری کا ارتکاب کیا تو اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کیوں کہ یہ جگہیں دراصل لوگوں کے مال کی حفاظت کے لئے بنائی گئی ہیں اور اس میں عام داخلہ کی اجازت دن کے لئے مخصوص ہے۔

(ایضاً صفحہ ۵۱۸)

(۱۵) ولا قطع علی الضیف اذا سرق ممن اضافہ۔

(ترجمہ) مہمان اگر میزبان کے مال پر ہاتھ صاف کر جائے تو اس پر قطع ید نہیں۔ (ایضاً)

(۱۶) ومن سرق سرقتہ فلم یخرجہا من الدار لم یقطع۔

(ترجمہ) جس نے کسی گھر میں چوری کی اور مال باہر نہ نکالا تھا تو اس چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹے جائیں گے۔ (ایضاً)

(۱۷) واذا لقب اللص البیت فدخل واخذ المال وناولہ اخر خارج البیت فلا قطع علیہما۔

(ترجمہ) اگر چور نے نقب لگا کر گھر کے مال پر ہاتھ صاف کر کے باہر کسی اور کو پکڑا دیا تو ان دونوں پر قطع ید کی سزا نافذ نہ ہوگی۔ (ایضاً)

(۱۸) وکذلک ان حملہ علی حمار فساقہ واخرجہ۔

(ترجمہ) اگر مال مسروقہ گدھے پر باہر لایا گیا تو ایسے چور پر بھی حد نہیں۔ (ایضاً)



(۱۹) ومن نقب البيت وادخل يده فيه واخذ شيئا لم يقطع۔  
(ترجمہ) اگر چور نے نقب لگا کر وہاں سے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی چیز چوری کر لی تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ (ایضاً)

(۲۰) وان طر صدة خارجته من الكم لم يقطع۔  
(ترجمہ) اگر کوئی آستین سے نکلی ہوئی تھیلی کاٹ لے تو اس پر بھی قطع ید نہیں۔ (ایضاً)

(۲۱) وان سرق من القطار بعيرا او حملا لم يقطع  
(ترجمہ) اگر کسی نے اونٹوں کی قطار سے اونٹ یا اس کا بوجھ چرائیا تو اس کا ہاتھ بھی نہیں کٹے گا۔ (ایضاً)

(۲۲) وان قطع سارق بسرقة فسرقته منه فلم يكن له ولا لرب  
السرقته ان يقطع الثاني۔

(ترجمہ) اگر چوری کے الزام میں کسی کا ہاتھ کاٹا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اس کے ہاں سے مال مسروقہ پر کسی اور نے ہاتھ صاف کر لئے تو نہ وہ اور نہ مالک مال دوسرے چور کا ہاتھ کٹوا سکتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۲۲ یا شرح فتح القدير جلد ۲ صفحہ ۲۵۵)  
(۲۳) ولا يقطع السارق الا ان يحضر المسروق منه فيطالب  
بالسرقته۔

(ترجمہ) چور پر سرقہ کی حد اتنے تک نافذ نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ شخص دعویٰ نہ کرے، جس کا مال چوری ہو چکا ہے۔ (ایضاً)

(۲۴) ومن سرق سرقته فردها على المالك قبل الارتفاع الى  
الحاكم لم يقطع۔

(ترجمہ) چور نے اگر مقدمہ کو عدالت میں لے جانے سے پہلے مال مسروقہ مالک کو واپس کر دیا تو قطع ید نہ ہوگا۔ (ایضاً)

(۲۵) واذا قضی علی رجل بالقطع فی سرقتہ فوہب لہ لم یقطع۔

(ترجمہ) اگر عدالت کے فیصلہ کے بعد مالک نے چور کو مال بخش دیا تو پھر بھی اس کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے۔ (ایضاً)

(۲۶) واذا ادعی السارق ان العین المسروقه ملکہ سقط القطع عنہ وان لم یقم بینتہ۔

(ترجمہ) اگر چور بلا دلیل کے دعویٰ کر دے کہ مال مسروقہ اس کی ملکیت ہے تو اس پر قطع ید کی سزا نافذ نہ ہوگی۔

(۲۷) وان سرق شاة فذبحھا ثم اخرجھا لم یقطع۔

(ترجمہ) بھیڑ چوری کرنے کے بعد ذبح کر کے باہر نکالی گئی تو اس صورت میں بھی قطع ید نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۲۶)

(۲۸) وان کان من القطاع صبی او مجنون او ذورحم محرم من المقطوع علیہ سقط الحد عن الباقرین۔

(ترجمہ) اگر لیٹروں میں کوئی بچہ یا مجنون شخص ہو یا جس پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے، ڈاکوؤں میں اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو دوسرے لیٹروں سے بھی حد ساقط ہو جائے۔ (ایضاً)

پردہ کی حدود

پردہ کا شمار اگرچہ اخلاقی احکامات کے تحت ہی آتا ہے۔ لیکن اس کی خلاف ورزی چونکہ مبادیات زنا میں سے ہے اس لئے اس کی خلاف ورزی پر بھی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس لئے ہم پردہ کی حدود کی وہ مخصوص شکلیں جو فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے متعین فرمائی ہیں۔ پیش خدمت کرتے ہیں۔

(۱) وعورت الرجل ماتحت السرۃ الی الرکتہ۔

(ترجمہ) مرد کے لئے جسم کو پردہ کرنے کی حدود ناف سے لے کر گھٹنوں تک

ہے۔

(۲) و بدن الحرة کلها عورة الا وجهها و کفہا

(ترجمہ) عورت چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو پردہ میں رکھے۔ (ایضاً)

(۳) وما كان عورة من الرجل فهو عورة من الامته بطنها

و ظهرها عورة و ماسوی ذلک من بدنہا لیس بعورة بقول عمر

الق عنک الخمار یاد فار آتشبین بالحرائر۔

(ترجمہ) لونڈی کے لئے بھی جسم کا اتنا حصہ پردہ میں رکھنا لازمی ہے جتنا کہ مرد

کو، اس کے علاوہ اس کی کمر اور پیٹ بھی پردہ میں شامل ہیں۔ اس کے سوا اس کے

باقی جسم کے لئے پردہ کی ضرورت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کے مطابق کہ

اے دفار اپنی اوڑھنی اتار دے، کیا تو شریف عورتوں کی مشابہت کرتی ہے۔ (ایضاً)

(۴) ولا يجوز ان ينظر الرجل الى الجنبیه الا وجهها و کفہا۔

(ترجمہ) مرد کے لئے کسی اجنبی عورت کو ہاتھوں اور چہرے کے سوا کسی اور چیز

کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے۔

(۵) ويجوز للمرأة ان تنظر من الرجل الى ما تنظر الرجل اليه

منه اذا امت الشوة۔

(ترجمہ) اور عورت بھی مرد کے جسم کا وہ حصہ دیکھ سکتی ہے جو مرد دیکھ سکتا

ہے بشرطیکہ شہوت سے امن میں ہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۴)

(۶) وتنظر الرجل من ذوات محارمه الى الوجه والراس

والساقين والعصدين ولا تنظر الى ظهرها وبطنها ونكدها۔

(ترجمہ) مرد ذو محرم عورتوں کے چہرہ، سر، سینہ، پنڈلیوں اور بازوؤں کی طرف

دیکھ سکتا ہے لیکن پیٹ، پیٹ اور رانوں کی طرف نظر کرنا اس کے لئے ناجائز ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۴۵)

(۷) وينظر الرجل الى مملوكه غير انى ما يجوز ان ينظر اليه من ذوات محارمه۔

(ترجمہ) مرد دوسرے کی لونڈی کے بدن کے وہ تمام حصے دیکھ سکتا ہے جو وہ ذوالمحارم کے دیکھ سکتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۳۶)

(۸) ولا باس بان بمس ذلك اذا ارادا الشراء وان خاف ان يشهى۔

(ترجمہ) اور وہ لونڈی کے جن حصوں کو دیکھ سکتا ہے اگر خریدنے کا ارادہ ہو تو انہیں چھو بھی سکتا ہے چاہے شہوت کا خدشہ ہی کیوں نہ ہو۔ (ایضاً)

### زنا کاری کی حد

زنا کاری ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے اس کی سخت سے سخت سزا تجویز کی ہے۔ لیکن کن صورتوں میں یہ سزا نافذ ہوگی اور کن صورتوں میں نہ ہوگی۔ فقہاء کرام کے نزدیک اس میں بھی بڑا اختلاف ہے۔

یہ ہیں شرعی حدود کی وہ صورتیں جو فقہاء کرام نے متعین فرمائی ہیں۔ اس حقیقت تو کسے بھی انکار نہیں کہ اس زمانے کے تقاضے مختلف تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق بھی ہیں یا ان صورتوں کے تعین میں کسی تدوید کی ضرورت ہے۔

میرا مقصد تو اہل علم کو اس طرف خصوصی توجہ دلانا تھا۔ اس سلسلے میں کسی مناسب فیصلہ تک پہنچنا اب ان کا کام ہے۔



## اسلامی قانون میں کوڑوں کی سزا کا تصور

پاکستان ٹیلی ویژن سے ہیروں کی سمگلنگ کے بارے میں بی۔ بی۔ سی کی ایک دستاویزی فلم دکھائی گئی ہے۔ اس فلم میں ایک مجرم کو کوڑے مارنے کا ایک دردناک منظر بھی تھا کوڑے اس سختی سے لگائے گئے کہ مجرم نو کوڑوں کے بعد بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مارشل لاء کے دور میں بہت سے لوگوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئی تھیں لیکن اہل وطن کی اکثریت نے کوڑے لگانے کے دردناک منظر کو پہلی دفعہ دیکھا جس نے بہت سے ناظرین کو ہلا کر رکھ دیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بعض مقامات پر عورتوں نے رونا شروع کر دیا تھا ملک کے باشعور طبقے نے اس منظر کی سخت مذمت کی کیونکہ اس سے ایسا تاثر قائم ہوتا تھا کہ ہم ابھی تک بربریت کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ بعض سیاسی و مذہبی لیڈروں نے اسلام کے نام پر کوڑوں کی اس سزا کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اسلام میں 'سزا کے فلسفہ کے مطالعہ کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسلام میں اس قسم کے کوڑوں کی سزا کا مطلقاً کوئی جواز نہیں۔ کوڑوں کی اس سزا کی ابتداء سابقہ مارشل لاء کے دوران ہوئی اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے قیام کے نعرے بھی لگائے گئے جس سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لیا

کہ کوڑے شائد اسلامی سزا ہے۔ غیر ملکی اخباروں میں اسی تعلق کی بنا پر اسلام کو بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا سے ہر قسم کی برائیوں اور نا انصافیوں کا خاتمہ کر دیا جائے، اس مقصد کے لئے اسلام سب سے پہلے مساوات پر مبنی ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے۔ کہ جو ہر فرد معاشرہ کے لئے مناسب معیار زندگی کی ضمانت دے۔ اگر کچھ لوگ اس ضمانت کے باوجود اس معاشرے کے خلاف جرائم کا ارتکاب کریں تو پھر شریعت اسلامی نے انہیں سزا دینے کا حکم دیا ہے سزا کا معاملہ بڑا نازک تھا۔ حکمران لوگ اپنی تسکین کے لئے لوگوں کو کڑی سزائیں دیتے ہیں۔ چنانچہ شریعت اسلامی میں ان سزاؤں کا تعین اللہ تعالیٰ نے خود ہی کر دیا۔ کہ لوگ زیادتی نہ کر سکیں ان سزاؤں کو شرعی حدود کہا جاتا ہے۔ یہ زنا کاری، زنا کاری کا جھوٹا الزام، چوری اور شراب خوری کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ ان حدود میں جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے مجرموں کو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے یہ سزا اسی سے سو کوڑوں تک ہے۔ جو جرائم حدود کی تعریف میں نہیں آتے ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دس کوڑوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔ تاہم اسلام میں کوڑوں کی سزا کا تصور، اس طریقے بالکل مختلف ہے جس کا نمونہ بی بی۔ سی کی دستاویزی فلم میں دکھایا گیا ہے۔ جو آدمی مجرم کو کوڑے مار رہا تھا وہ تیزی سے دوڑتا ہوا آتا اور پوری قوت سے کوڑے رسید کرتا تھا۔ ایسے آٹھ دس کوڑوں سے تو مجرم کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اسلام میں کوڑوں کی سزا کا مقصد مجرم کی جان لینا نہیں۔ بلکہ اسے شرمسار کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اس شرم کی وجہ سے اس قسم کے جرائم سے باز آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مجرموں کو جس طرح کوڑے مارے گئے اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ابتدائی اسلامی معاشرے میں کوڑے مارنے کے لئے چار چیزیں استعمال ہوتی تھیں کھجور کی چھڑیاں، کوڑے، جوتے اور تمہ کئے ہوئے کپڑے (نیل الاوطار جلد ہفتم ۴۸) جرم کی سنگینی کے لحاظ سے یہ چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ عام طور پر مجرموں کو جوتوں سے مارا جاتا تھا کہ

اس سے انہیں زیادہ شرمندگی ہوتی۔ پھر اس مقصد کے لئے کسی موٹے تازے آدمی کی خدمات حاصل نہیں کی جاتی تھیں۔ بلکہ جو لوگ موجود ہوتے انہیں کہا جاتا کہ وہ مجرم کو ایک ایک دو جوتے رسید کریں۔ سورہ النور میں ارشاد ربانی ہے کہ جب ایسے مجرموں کو سزا دی جا رہی ہو تو مسلمانوں کی ایک جماعت کو سزا کے مقام پر موجود ہونا چاہیے۔ یہی جماعت کوڑے بھی لگاتی اور مجرموں کو جوتے بھی مارتی ایک دفعہ ایک شرابی کو حضور کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اسے چالیس کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ اس وقت موقع پر بیس صحابہ کرام موجود تھے۔ ان سب نے اسے دو دو جوتے مارے (نیل الاوطار حوالہ سابقہ) اسی طرح بعض اوقات مجرموں کو تہہ کئے ہوئے کپڑے سے مارا جاتا تھا۔

جہاں تک کھجور کی چھڑی کا تعلق تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک گز کی لمبائی مقرر کی یعنی ایک میٹر سے بھی کم۔ اس کی موٹائی انگلی کے برابر ہوتی تھی۔ چمڑے کا کوڑا۔ سنگین جرموں کی صورت میں استعمال میں آتا تھا اور اس مقصد کے لئے بھی ایسا کوڑا منتخب کیا جاتا تھا جو زیادہ سخت نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ استعمال کی وجہ سے پرانا ہو چکا ہوتا تھا۔ کوڑے مارنے والے کو اپنا ہاتھ اس حد تک اونچا کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ اس کی بغل نظر آجائے۔ اور نہ ہی مجرموں کے کپڑے اتارے جاتے تھے۔ (جامع احکام القرآن از علامہ قرطبی جلد ۱۲ صفحہ ۱۶۳)

اسلام کا ہر طریقہ سزا کافی مؤثر ثابت ہوا اور مجرم شرمندگی کی وجہ سے دوبارہ جرائم کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ لیکن سابقہ مارشل لاء کے دور میں جو کوڑوں کی سخت سزائیں دی گئیں۔ ان سے جرائم کم ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہوا۔ کوڑوں کے ان منفی اثرات پر یورپ میں علمی تحقیق ہوئی تھی خاص کر یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ طالب علموں پر بدنی سزا کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس تحقیق کے نتیجے میں یہ تلخ حقیقت سامنے آئی تھی کہ جن بچوں کو بیدردی سے مارا

جاتا تھا نہ تو وہ اچھے طالب علم بنے اور نہ ہی اچھے شہری۔ اور ایسا ہی اثر مجرموں پر پڑتا تھا۔ چنانچہ بدنی سزا کو قانونی طور پر ختم کر دیا گیا۔ صرف خاص خاص حالتوں میں اسی کی اجازت تھی کہ اس کے بغیر کوئی چار کار نہ ہوتا اور ایسی سزا کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس وقت پاکستان سمیت دنیا کے بہت سے ممالک میں اہل یورپ کی حکومت تھی، انہوں نے اپنے مقبوضہ ممالک میں بھی یہی قانون رائج کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ سزا کے جس طریقے پر قیام پاکستان سے پہلے پابندی لگائی جا چکی تھی۔ اسے ہمارے ملک میں پچاس سال بعد پھر مروج کر دیا گیا۔ اگر معاشرے کے تمام طبقات کے مجرموں کو کوڑوں کو یہ سزا دی جاتی تو شاید اس کا کچھ اثر بھی ہوتا۔ لیکن یہ عام الزام ہے کہ امیر گھرانوں کے مجرموں کو یہ سزا نہ دی جاتی اس کا اطلاق معاشرے کے غریب لوگوں پر ہی کیا جاتا۔ سابقہ مارشل لاء کے دوران امیر گھرانوں کے کئی مجرموں کو پکڑا گیا۔ لیکن انہیں کوڑوں کی سزا نہ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ کوڑوں کی سخت سزاؤں کے باوجود ہمارے معاشرے سے جرائم کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ بلکہ اٹان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

کوڑوں کی سزاؤں سے جرائم کا خاتمہ تو نہ کیا جاسکا۔ البتہ ہم مہذب دنیا میں اسلام کی بدنامی کا باعث بن گئے۔ بد قسمتی سے ان سزاؤں کو دوبارہ اس وقت حکمرانوں نے رائج کیا جب وہ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے دعوے کر رہے تھے جس کی وجہ سے یہ غلط تصور قائم ہو گیا کہ یہ اسلامی سزا کا حصہ ہیں یہ کوڑے اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے۔ ہمارے معاشرے سے ان کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے لیے بھی بہتر ہوگا اور اسلام کی بھی یہ بہترین خدمت ہوگی کہ اسے مہذب دنیا میں بدنامی سے بچایا جاسکے گا۔ (جون ۱۹۸۹ء)





## بدکاری کی تہمت از خود سنگین جرم

ہمارے ملک میں جس طرح شرعی حدود کو غلط طور پر استعمال کیا گیا اس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے سے خرابیوں کا ختم ہونا تو کجا الٹا ان میں اضافہ ہو چکا ہے اور ان حدود کے حوالے سے معاشرے کے جن طبقوں سے نا انصافی ہوئی ہے۔ وہ ان حدود کے خاتمے کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ دراصل ان حدود کی ناکامی کے کئی اسباب ہیں جن کی طرف اس کے علمبرداروں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ منجملہ ان اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ان شرعی حدود کو نافذ کرنے والے لوگوں کو اس بارے میں شرعی احکامات کا مناسب علم نہیں ہے۔ بلکہ خود ہماری علماء حضرات بھی اس بارے میں ضروری تفصیلات کے سلسلے میں جاہل ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال پنجاب کے ایک سابق وزیر اعلیٰ اور گورنر کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ درج کرانا ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق ان سابق گورنر صاحب کو ایک عورت مسماں عدیلہ کے ساتھ ایک ہوٹل کے کمرے میں غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کرتے ہوئے اس عورت کے خاوند نے دیکھ لیا اور اس کے حوالے سے اس نے سابق گورنر کے خلاف پولیس میں مقدمہ رجسٹرڈ کرا دیا۔ حالانکہ اسلامی قانون کے مطابق یہ معاملہ

سرے سے حدود آرڈیننس کے تحت ہی نہیں آتا یہ معاملہ ”لعان“ کے تحت آتا ہے جب کسی عورت پر اس کا خاوند بد اخلاقی کا الزام لگائے تو شریعت اسلامی کے مطابق اس کا فیصلہ لعان کے طریقے سے ہوتا ہے۔ لعان کے شرعی حکم کی تفصیلات آئندہ سطور میں بیان کی جائیں گی۔ یہ معاملہ صرف اس صورت میں شرعی حدود کے ذیل میں آتا جب چار دوسرے لوگ اس امر کی گواہی دیتے کہ انہوں نے ان دو افراد کو غیر اخلاقی حرکات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خیال رہے کہ حدود کے تحت بھی یہ مقدمہ صرف اس وقت رجسٹر ہو سکتا ہے کہ جب چار گواہ ایک ہی جیسی گواہی دیں اور اگر ان کی گواہی میں کوئی فرق ہو یا گواہوں کی تعداد چار سے کم ہے تو پھر شرعی حدود کے تحت یہ گواہی مجرم قرار پاتے ہیں اور مقدمہ الٹا ان کے خلاف رجسٹر کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلعم کے زمانے میں ایک صحابی ہلال بن امیر نے اپنی بیوی پر الزام لگایا کہ وہ ایک شخص شریک بن سحاء کے ساتھ غیر اخلاقی فعل کی مرتکب ہوئی ہے۔ یہ مقدمہ جب رسول اللہ صلعم کی عدالت میں پیش ہوا تو آپ نے فیصلہ دیا کہ یہ لعان کا معاملہ ہے۔ یہ شرعی حدود کے ذیل میں نہیں آتا۔ چنانچہ آپ نے شریک بن سحاء کو توبری کر دیا اور اس پر کوئی شرعی حد نافذ نہ کی۔ البتہ میاں بیوی کے لئے لازمی قرار دیا کہ وہ ایک دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے لعان کریں۔ شریعت اسلامی میں لعان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس بارے میں تفصیلی احکامات خود قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات کا ترجمہ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن سے پیش کیا جاتا ہے۔

(ترجمہ) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر (بد اخلاقی) الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنی سوا کوئی دوسرا گواہ نہ ہو تو ان میں سے ایک شخص (یعنی شوہر) کی شہادت یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ اپنے الزام میں سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو کہ اگر وہ اپنے الزام میں جھوٹا ہوا۔ اور

عورت سے سزا اس طرح مل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کر یہ شخص اپنے الزام میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس عورت پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ اپنے الزام میں سچا ہو“ (سورۃ النور - ۶-۹) تفسیم القرآن جلد سوم صفحہ ۳۵۵

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ پنجاب کے سابق گورنر کے خلاف جو مقدمہ رجسٹرڈ کرایا گیا ہے اس کا نہ تو شرعی حدود سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی اسلامی تعلیمات میں اس بارے میں کوئی حکم ہے اس معاملہ کی اصل مجرم مسماں عدیلہ قرار پائی ہیں ان کا شوہر صرف اپنی بیوی کے خلاف مقدمہ درج کرا سکتا تھا اور اس کا فیصلہ بھی لعان کے مطابق ہونا تھا جس کی تفصیلات سابقہ سطور پر سورۃ النور سے پیش کی جا چکی ہیں۔

(زنا کا ذی کے مجرم کے خلاف جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، صرف اس صورت میں مقدمہ دائر ہو سکتا ہے جب کہ چار موقع کے گواہ، یہ گواہی دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس بد اخلاقی کے فعل کو دیکھا ہے اگر ان گواہوں کی گواہی میں کوئی فرق ہو گا یا ایک بھی گواہ کم ہو جائے گا تو پھر شریعت اسلامی کے نزدیک یہی گواہ مجرم قرار پاتے ہیں۔ کسی پر زنا کاری کی تہمت لگانا شریعت اسلامی میں زنا کاری سے بھی بڑا جرم ہے اور اس کی وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ زنا کار پر حد نافذ ہو جانے کے بعد اس کی گواہی قبول ہو سکتی ہے لیکن زنا کی تہمت لگانے والے کی گواہی اس پر حد جاری ہو جانے کے باوجود بھی قابل قبول نہیں ہوتی اور اس بارے میں قرآن مجید کی سورۃ النور میں واضح حکم موجود ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں ایک ایسے ہی مقدمے کی تفصیلات ملتی ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر زنا کاری کے جرم کی تہمت لگائی۔ مقدمہ حضرت عمر بن الخطابؓ خلیفہ دوم کی عدالت میں پیش ہوا لیکن اس مقدمے میں جو چار گواہ پیش ہوئے ان کی گواہیوں کے بیانات میں واضح تصادم موجود تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے مغیرہ بن شعبہؓ کو تو بری کر دیا۔ البتہ

ان چاروں گواہوں پر شرعی حد نافذ کر دی اور انہیں اسی اسی کوڑے لگائے اور اس کے بعد آپ ان کی گواہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔

خیال رہے کہ یہ حضرت ابوبکرؓ وہی صحابی ہیں جن سے عورت کی حکمرانی کے خلاف روایت ہے چونکہ اس قذف کے جرم میں ان پر شرعی حد نافذ کی گئی تھی اس لئے حضرت عمرؓ کسی معاملے میں ان کی گواہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ ذاتی یا شخصی رائے پر منحصر نہیں تھا بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ قرآن مجید کے احکامات جن کی تفصیلات سابقہ سطور میں گزر چکی ہیں (سورۃ النور۔ ۴ کی روشنی میں دیا تھا) تہذیب التہذیب از علامہ ابن حجر عسقلانی جلد دہم صفحہ ۴۶۹

خیال رہے کہ جب ان کی گواہی چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات میں تسلیم نہیں کی جاتی تھی تو پھر رسول اللہ صلعم کی احادیث کے بارے میں کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے اس لئے ان کی روایت کردہ احادیث کو ضعیف سمجھا جاتا ہے۔

شریعت اسلامی کی نظر میں کسی مرد یا عورت پر زنا کاری کا الزام لگانا نہایت ہی سنگین جرم ہے کیونکہ صرف الزام لگانے سے ہی ان افراد کی شہرت و اقدار ہو جاتی ہے اور وہ معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے اس لئے اس سلسلے میں بے جا اور غلط الزامات کی روک تھام کے لئے شریعت اسلامی نے ایسے احکامات دیئے ہیں کہ کوئی بد طینت فرد اس سلسلے میں اسلامی شرعی حدود کا ناجائز طریقے سے نفاذ نہ کرا سکے لیکن ہمارے ہاں جس طرح ان حدود کا نفاذ کرایا جا رہا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اول تو اس بارے میں کسی کو شریعت اسلامی کے احکامات کا صحیح علم نہیں جیسا کہ مقدمہ زیر گفتگو میں کیا گیا۔ اسلامی قانون کے مطابق اس مقدمے کی اصل مجرم وہ عورت قرار پائی ہیں۔ جس کے ساتھ بد اخلاقی کے فعل کا الزام لگایا گیا ہے۔ مقدمہ صرف اس کے خلاف درج ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا اور دوسرے فرد کے خلاف جھوٹا مقدمہ درج کر دیا گیا۔ جس کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ متعلقہ فرد کے خلاف شرعی حدود کے تحت مقدمہ اس لیے

درج نہ کرایا گیا کہ موقع کے چار گواہ موجود نہیں تھے۔

علماء حضرات جو ملک میں نافذ شرعی حدود کو اسلامی نظام کی طرف ایک اہم پیش رفت قرار دیتے تھے انہیں اس صورتحال پر غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب ہی ان شرعی حدود کو غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ تو عوام ان کے بارے میں منفی رد عمل کا اظہار کرتے ہیں اگر وہ ان شرعی حدود کو بچانا چاہتے ہیں تو پھر انہیں دیانتداری سے کام لینا ہوگا اور جب بھی شرعی حدود کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے انہیں فوراً اس کی نشاندہی کرنی چاہیے۔ جیسا کہ انہیں سابق گورنر کے خلاف غلط مقدمہ رجسٹر کرائے جانے کی صورت میں کرنا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خود بھی شرعی حدود کے نفاذ کے بارے میں مخلص نہیں۔ (فروری ۱۹۹۰)



## مسئلہ ارتداد کے بارے میں شرعی حکم کی غلط تعبیر

ان دنوں انگلستان کے اخبارات میں ارتداد کے بارے میں اسلامی قانون پر بحث ہو رہی ہے۔ اس بحث کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک پاکستانی نژاد برطانوی مسلمان باشندے عبدالمالک نے اپنی جوان بیٹی کو چھری سے ذبح کر دیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک غیر مسلم انگریز سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پاکستان سے گئے ہوئے علماء نے فتویٰ دیا کہ عبدالمالک کی بیٹی پروین ملک مرتد ہو گئی ہے اور واجب القتل ہے۔ چنانچہ اس کے والد نے اپنے اسلامی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے چھری لے کر اپنی بیٹی کو ذبح کر ڈالا۔ اس جرم کے ارتکاب میں پولیس عبدالمالک کو پکڑ کر لے گئی اور ایک جیوری کے سامنے پیش کیا جیوری نے اسے مجرم قرار دیتے ہوئے عدالت کے سپرد کر دیا ہے۔ تاکہ وہ اس بارے میں اپنا آخری فیصلہ دے۔

اس واقعہ کی تفصیلات بی بی سی سے بھی نشر کی گئیں اور ہمارے ایک مقامی روزنامہ کی دس جولائی ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوئیں۔ اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہمارے مخلص بھائیوں نے عبدالمالک کے اس جرات مندانہ اقدام کی تعریف کی اور کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس بارے میں شریعت اسلامی کے اصل احکامات کیا ہیں۔

شریعت اسلامی کی رو سے مرتد کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو مرتد ہو جانے کے بعد اسلام کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔ ایسے مرتدوں کی سزا تو واقعی قتل ہے۔ لیکن

یہ سزا اسلامی حکومت کی طرف سے دی جائے گی کوئی فرد قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ مرتد کی دوسری قسم وہ ہے کہ انسان اپنے مذہب کو تبدیل کر لے۔ شریعت اسلامی کی نظر میں یہ فعل بھی گناہ عظیم ہے لیکن اس کے لئے اس دنیا میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی سزا خود دیں گے۔ اس سلسلے میں ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی احکامات پر صرف اسلامی ریاست ہی میں عمل کیا جاسکتا ہے مثلاً سود شریعت اسلامی کے مطابق گناہ ہی نہیں بلکہ ایک سنگین جرم بھی ہے قرآن مجید نے اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑائی کے مشابہ قرار دیا ہے۔ (سورۃ البقرہ ۲۷۹) اس جرم کی بھی شریعت میں وہی سزا ہے جو اسلامی ریاست کے دشمن مرتد کی ہے۔ لیکن ہمارے یورپ میں رہنے والے مسلمان بھائیوں جن میں عبدالمالک صاحب بھی شامل ہیں اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ کیونکہ اس طرح وہ سب لوگ واجب القتل قرار پاتے ہیں۔ ان کی طرف سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یورپ کے سرمایہ دارانہ معاشرے میں سود سے بچنا مشکل ہے لیکن وہ سود کی رقم کو اپنے اوپر خرچ کرنے کی بجائے دین کی تبلیغ پر خرچ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے پاکستان سے علماء حضرات کو دعوت دے کر بلایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے علماء جو یورپ کے دورے کرتے رہتے ہیں ان کے اخراجات خالص سود کی رقم سے پورے کئے جاتے ہیں۔ یہ حضرات پروین جیسی معصوم لڑکیوں پر جن اسلامی احکامات کا نفاذ کراتے ہیں خود ان احکامات کا اپنے اوپر نفاذ کیوں نہیں کراتے۔ اور سابقہ سطور میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان دونوں جرائم کی سزا ایک ہی ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے شریعت اسلامی میں مرتد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو دین اسلام سے پھر جائے اور اسلامی حکومت کے لئے خطرہ بن جائے۔ دوسرا وہ جو محض اپنا دین تبدیل کرتا ہے۔ ان دونوں کے احکامات مختلف ہیں۔ جن مرتدوں کو واجب

القتل قرار دیا جاتا ہے ان کے بارے میں سورہ مائدہ کی مندرہ ذیل آیات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

(ترجمہ)..... جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کیلئے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ (تو انہیں معاف کر دینا چاہیے) تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (سورۃ المائدہ ۳۳، ۳۴)

علامہ طبری نے اپنی مشہور تفسیر جامع البیان میں اس آیت کے شان نزول کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ آیات قبیلہ مذنیہ کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں یہ لوگ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے ان میں سے اکثر بیمار تھے رسول اکرمؐ نے انہیں بیت المال کے اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تاکہ وہاں وہ ان اونٹوں کا دودھ پیئیں لیکن جب یہ لوگ صحت یاب ہو گئے تو انہوں نے بیت المال کے چرواہوں کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے رسول اللہؐ کو ان کی اس حرکت کا علم ہوا تو ان کا تعاقب کر کے انہیں پکڑوا لیا چونکہ یہ لوگ صرف اسلام ہی سے نہیں پھر گئے تھے بلکہ اسلامی ریاست کے خلاف ایک شدید جرم کے مرتکب بھی ہوئے تھے اس جرم کو قرآن مجید میں حارب اللہ ورسولہ کی اصطلاح میں بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی۔ چنانچہ ان مجرموں کو ٹھیک اسی طرح قتل کیا گیا جس طرح انہوں نے رسول اکرمؐ کے چرواہوں کو قتل کیا تھا۔

اسی اصول کی روشنی میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان عرب قبائل کے خلاف جنگ کی تھی۔ جنہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ انہوں نے اس بار کے ساتھ ہی مدینہ منورہ پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ (تاریخ طبری جلد چہارم صفحہ



چنانچہ ان تفصیلات کی روشنی میں مسلمان فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ صرف ایسے مرتدوں کو قتل کی سزا دی جائی جو مرتد ہو جانے کے بعد کسی حیثیت سے بھی اللہ اور اس کے رسولؐ یعنی اسلامی حکومت کے خلاف لڑائی کے مرتکب ہوں۔ دوسری قسم کے مرتد جو صرف اپنا مذہب تبدیل کرتے ہیں ان کے بارے میں بھی قرآن مجید میں واضح احکامات موجود ہیں جو درجنوں آیات میں بیان کئے گئے ہیں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں سے صرف چند آیات کو پیش کیا جاتا ہے۔

(ترجمہ) جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تب تو کوئی بات نہیں مگر جنہوں نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کیا ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔  
(سورۃ النحل ۱۰۴)

دیکھئے اس آیت کے مطابق دین اسلام کو ترک کرنے والے کو سزا تو ملے گی لیکن یہ سزا قیامت کے دن ملے گی پہلی قسم کے مرتد کی طرح اسے اس دنیا میں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

(ترجمہ) اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ تعالیٰ بندگی کرتا ہے اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی یہ ہے صریح خسارہ۔ (سورۃ الحج ۱۱)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو معاف نہیں کرے گا۔ اور نہ کبھی انہیں راہ راست دکھائے گا۔ (سورۃ النساء ۱۳)

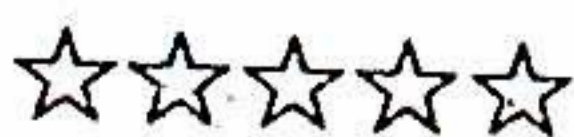
اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو بار بار مرتد ہو رہے ہیں اگر اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو پھر ان لوگوں کا پہلے ارتداد کے بعد ہی خاتمہ ہو جاتا لیکن یہاں تو ان کے مرتد ہونے کا بار بار ذکر ہے یہاں تک کہ اس ارتداد کے سلسلے میں

آخر میں بھی نہیں فرمایا کہ انہیں قتل کر دیا جائے بلکہ صرف یہ فرمایا کہ یہ لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائے گا۔ ہاں قیامت کے دن انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

مرتد کی سزا کے سلسلے میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان میں قتل کئے جانے والے مرتد کے لئے حارب اللہ ورسولہ کی شرط لگائی گئی یعنی اللہ اور اس کے رسول یا ان کے قائم کردہ نظام سے جنگ کرنے والا۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین آدمیوں کے قتل کی اجازت دی ہے پہلا وہ شخص جو کسی دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے، دوسرا وہ جو شادی کے بعد زنا کاری کا ارتکاب کرتا ہے اور تیسرا وہ جو مرتد ہو کر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ (صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۱۹)

اس موضوع پر اکثر احادیث میں تو یہ قید موجود ہے جو قرآن مجید کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اس لئے اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ اگر بعض احادیث میں یہ قید نہ بھی ہوگی تو سمجھا جائے گا کہ یہ قید موجود ہے۔

مختصر یہ کہ شریعت اسلامی میں صرف ایسا مرتد واجب القتل ہے جو دین اسلام سے پھر جانے کے علاوہ اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرے اور مسلمانوں کیلئے خطرہ بن جائے صرف مذہب بدلنا گناہ ضرور ہے لیکن اس کی سزا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دیں گے ایسے گناہ کے لئے کوئی دنیاوی سزا مقرر نہیں کی گئی جن علماء نے عبدالمالک کو اپنی لڑکی قتل کرنے کا فتویٰ دیا ہے وہ خود اسلامی قانون کے مطابق مجرم قرار پاتے ہیں کیونکہ ان کے سارے اخراجات خالص سود سے پورے کئے جاتے ہیں جو اسلامی قانون کے مطابق ارتداد کے مساوی جرم ہے اگر ہمارے علماء معصوم بچیوں پر علماء خود اسلامی قانون نافذ کراتے ہیں تو انہیں وہی قانون اپنے اوپر بھی نافذ کرنا چاہیے۔ (اگست ۱۹۸۹ء)



## چوری کی شرعی حد

ہمارے ہاں ہر معاملے میں مہارت حاصل کرنے کے لئے علم حاصل کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے لیکن شریعت اسلامی ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لئے علم حاصل کرنے کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کیا جاتا جو جس کے منہ میں جو آتا ہے کہے جاتا ہے اس بارے میں اگر کوئی صاحب احتیاط سے کام لیتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ بیان دینے سے پہلے اس مسئلہ کے بارے میں کسی مولوی صاحب سے پوچھ لے لیکن خود ان مولوی حضرات کا شریعت اسلامی کے بارے میں علم کا جو حال ہے اس کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے اس کا اندازہ قارئین کو راقم کے ایک سابقہ مضمون سے ہو گیا ہو گا جس میں راقم نے یہ دکھایا تھا کہ پاکستان میں مولویوں کے سب سے بڑے ادارے یعنی اسلامی نظریہ کی کونسل کے علماء کے نزدیک کتے کی گواہی تو قبول ہے لیکن مسلمان عورت کی گواہی ان کے نزدیک مردود ہے۔

ایسے سیاسی لیڈر جو اپنے آپ کو زیادہ تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں ان کا سہارا قرآن مجید کے انگریزی تراجم ہیں یہ بات بڑے افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ اس وقت قرآن مجید کے جو ترجمے متداول ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ

ان حضرات کا عربی زبان کا علم بہت ہی ناقص تھا ایک عیسائی پادری راڈویل نے عیسائی مشنریوں کے لئے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کیا تھا اس نے اسلامی تعلیمات پر بھی عیسائی عقائد کی چھاپ لگا دی بعد میں ہمارے مسلمان اہل علم نے قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا انہوں نے اس پادری کے ترجمے میں کچھ کمی زیادتی کر کے اپنے نام سے پیش کر دیا یہ غلط ترجمے آج ہمارے پڑھے لکھے لیڈروں کا سارا علمی سرمایہ ہے اور اس کے حوالے سے وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی اسلامی گفتگو میں عیسائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔

شریعت اسلامی کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا لیکن ہمارے علماء حضرات نے اپنی جہالت کی وجہ سے اسے انسانیت کے لئے زحمت بنا دیا ہے ہماری جہالت کا ایک شاہکار چوری کی سزا میں چوروں کے ہاتھ کاٹنا ہے دنیا جانتی ہے کہ اس سزا کا اطلاق تاریخ کے کسی دور میں اثر و رسوخ والے لوگوں پر نہیں کیا گیا تو غریبوں پر اس سزا کا اطلاق کیا گیا یا حکمرانوں نے اپنے مخالفوں پر چوری کے الزام لگا کر ان کے ہاتھ کاٹے اس کی زندہ مثال خود ہمارا یہ جدید زمانہ ہے جہاں بارہ سال پہلے شرعی حدود نافذ کی گئی تھیں عدالتوں نے درجنوں افراد کے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی لیکن چونکہ ان کا تعلق باثر خاندانوں سے تھا اس لئے کسی کے ہاتھ نہیں کاٹے گئے اتفاق سے کوئی غریب چور حکومت کے ہاتھ نہ لگا کہ جس کے ہاتھ کاٹ کر وہ اپنے اسلام کا ڈھنڈورہ پیٹتی آئندہ سطور میں ہم چوری کی شرعی حد کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

چوری کی شرعی حد کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ضروری محسوس کرتا ہوں کہ اس بات کا ذکر کر دیا جائے کہ اسلامی معاشرے میں شرعی حدود نافذ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے خود رسول اللہؐ نے ایسا معاشرہ قائم کرنے کے بعد ہی شرعی حدود کا نفاذ کیا تھا اس مقصد کے لئے مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ کی ضرورت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا

ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے دور حکومت میں ملک میں قحط پڑ گیا اور حکومت اسلامی معاشرے کی ضروریات کو کماحقہ پوری نہ کر سکی تو حضرت عمرؓ نے شرعی حدود کا نفاذ معطل قرار دے دیا تھا چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے ان سے کام لینے والوں کو سزا دی کہ وہ انہیں مناسب معاوضہ نہیں دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔

چوری اور ڈکیتی ایسے جرائم ہیں جن کے ذریعے دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے حالیہ کو آپریٹو سیکنڈل میں جن لوگوں نے لاکھوں غریب لوگوں کی عمر بھر کی کمائی ہتھیائی ہے وہ لوگ بھی اسے زمرے میں آتے ہیں ڈکیتی کو چوری کی نسبت زیادہ سنگین جرم سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں ڈاکہ ڈالنے والے بعض اوقات لوگوں کو جان سے مار دینے میں بھی باک محسوس نہیں کرتے قرآن مجید میں اس جرم کو فساد فی الارض قرار دیتے ہوئے اس کی یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔

(ترجمہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں آزادی سے محروم کر کے قید میں ڈال دیا جائے (سورۃ المائدہ - ۳۳)

اس کے کچھ عرصہ بعد چوری کی شرعی حد کے بارے میں بھی قرآن مجید کی اسی سورت میں احکامات نازل ہوئے جن کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

”اور چور چاہے وہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عبرتناک سزا بھی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر غالب ہے“ (سورۃ المائدہ - ۳۸)

ڈکیتی کا جرم جیسا کہ واضح ہے چوری سے زیادہ سنگین ہے اس کے لئے قرآن مجید میں تین سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ یعنی قید کرنا ہاتھ پاؤں کاٹنا اور پھانسی پر چڑھانا

ان تین سزاؤں میں سے قید کی سزا سب سے ہلکی ہے اور یہ اس وقت دی جائے گی جب جرم کی نوعیت زیادہ سنگین نہیں ہوگی جرم سنگین ہوتا جائے گا تو سزا بھی سخت ہوتی جائے گی سلطان اورنگ زیب عالمگیر جس نے اپنی زندگی برصغیر ہندوستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی انہوں نے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی بجائے قید کی سزا نافذ کر رکھی تھی۔

انہوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پانچ صد علماء کو اکٹھا کیا تھا ان علماء حضرات نے حنفی فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری مرتب کی تھی جب یہ فتاویٰ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بہت سے معاملات کے بارے میں ان علماء سے اختلاف کیا ان میں سے ایک چوری کی سزا کے بارے میں قانون کے بارے میں تھا انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں امام شافعی کا فتاویٰ حنفی فقہ کی نسبت قرآن مجید کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہے وہ چوری کے مجرم کے لئے قید کی سزا تجویز کرتے ہیں اور اگر چور قید کے دوران اپنے جرم سے توبہ کرے تو پھر اس کے جرم کو معاف کر دے توبہ سے مراد صرف زبان سے توبہ کا لفظ کہنا مراد نہیں بلکہ اس سے مراد جرم کی تلافی کرنا ہے چنانچہ امام شافعی کے اس فتویٰ کی روشنی میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے مندرجہ ذیل فرمان نمبر ۳۳ جاری کیا۔

”کہ جب اسلامی قانون کے مطابق کسی پر چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے قید کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ اپنا جرم سے توبہ کر لے“ (مرآة احمدی از مرزا محمد حسین مطبوعہ کلکتہ جلد اول صفحہ ۲۷۸)۔

مختصر یہ کہ فتاویٰ عالمگیری کو مرتب کرنے والے پانچ صد علماء کے فتویٰ کو ترک کر کے سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے انہیں قید کرنے پر اکتفا کیا اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں کسی چور کے ہاتھ نہ کاٹے لیکن چونکہ کسی حد تک مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کر دیا تھا اس لئے چوری کے جرائم خود بخود کم ہو گئے اگرچہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے چوروں

کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے انہیں قید میں ڈالنا کافی سمجھا لیکن بعض ممالک کے اسلامی حکمران ایسے بھی تھے جنہوں نے قدامت پسند علماء کے فتاویٰ پر عمل کرتے ہوئے چوروں کے ہاتھ کاٹنے دراصل اس سزا کے پردے میں وہ اپنے مخالفوں سے نبٹنا چاہتے تھے اور ان پر چوری کے الزام لگا کر ان کے ہاتھ کٹوا دیئے مسلمانوں کے ہر دور میں روشن خیال علماء کی بھی کمی نہیں رہی انہوں نے اس طرح ہاتھ کاٹنے کو قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف قرار دیا۔

انہوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن مجید اس طرح ہاتھ کاٹنے کی اجازت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ دور رسالت اور خلافت راشدہ میں اس طرح چوروں کے ہاتھ نہیں کاٹے گئے تھے انہوں نے کہا کہ ہاتھ کاٹنے کی تفسیر تو خود قرآن مجید میں سورۃ یوسف میں بیان کر دی گئی ہے اس سلسلے میں وہ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ جب منصر کی عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف سے عشق کا مذاق اڑایا تو اس نے ان تمام عورتوں کو ایک دعوت پر بلایا ان کے ہاتھوں میں پھلوں کو کاٹنے کے لئے چھریاں دیں۔ لیکن جب ان کے سامنے حضرت یوسف کو لایا گیا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں اور بے خیالی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے (سورۃ یوسف ۳۱)۔

ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر انہیں اپنے پیچھوں سے علیحدہ نہیں کر دیا تھا بلکہ بے خیالی میں انہیں زخمی کر دیا تھا اس لئے ان روشن خیالی علماء نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ اگر چوری کے مجرم کے ہاتھ پر ایسا زخم لگا دیا جائے کہ جو مندمل ہو کر بھی واضح طور پر نظر آتا ہے تو یہ ہاتھ کاٹنے کے مترادف سمجھا جائے گا خود چور کو یہ نشان اس کے جرم کا احساس دلاتا رہے گا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت کا احساس دلاتا رہے گا۔

دنیا کے عرب کے دانشور ابو الاعلیٰ مصری اہاری نے جب چند لوگوں کے ہاتھ کٹے ہوئے دیکھے تو انہوں نے علماء حضرات پر ایسی طنز کی کہ خود انہیں اپنے فتاویٰ پر شرم محسوس ہونے لگی انہوں نے کہا کہ اگر کسی مسلمان کا ہاتھ غلطی سے کٹ جائے

تو اسے پچاس اونٹ یا پانچ صد دینار معاوضہ دینا پڑتا ہے لیکن ایک چوتھائی دینار کے لئے لوگوں کے ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں (تفسیر روح المعانی جلد ششم صفحہ ۱۳۴)۔

اس کے نتیجے میں مسلمان فقہاء نے چوری کے جرم کی ایسی تشریح کرنی شروع کی کہ پھر کسی چور کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اس تبدیلی کی چونکہ کافی تفصیلات ہیں اس لئے اسے ایک علیحدہ مضمون کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا یہ تفصیلات بہت ہی عجیب و غریب ہیں کیونکہ ان کے ذریعے چوری کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔

شریعت اسلامی معاشرے سے چوری کے جرم کو ختم کرنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری نہیں کہ لوگوں کے ہاتھ کاٹ کر انہیں بے بس کر دیا جائے کہ نہ تو وہ اپنی صفائی کر سکیں اور نہ ہی نماز پڑھ سکیں بلکہ معاشرے پر بوجھ بن جائیں حیرت کی بات ہے کہ جو بات آج سے تین سو سال پہلے سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی سمجھ میں آگئی تھی وہ اس روشنی کے دور میں اسلامی نظام کے علمبرداروں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر خود ایک بہت بڑا عالم دین تھا جبکہ ہمارے علماء دین علم حاصل کرنے کی بجائے محض سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بارہ سال پہلے چوری کے بارے میں شرعی حد کو نافذ کیا گیا لیکن اس سے چوری کے واقعات ختم ہونے کی بجائے ان میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا وجہ یہ ہے کہ شرعی حدود کا نفاذ سرمایہ دارانہ معاشرے میں کیا گیا تھا حالانکہ ان کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے لیکن ایسے معاشرے کے قیام سے چونکہ مفت خوروں کو چھٹی ہوتی ہے اس لئے چاہے علماء حضرات ہوں، چاہے سیاسی لیڈر ایسے معاشرے کے قیام کا نام نہیں لیتے اس معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں زمین کی خرید و فروخت ہی سرے سے حرام ہے ہر مسلمان اپنی ضرورت کے مطابق زمین سے فائدہ اٹھا سکتا



ہے۔ (صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۸۱۷ حامد اینڈ کو ایڈیشن)

امید ہے کہ ان گزارشات کی روشنی میں وہ لوگ جو اپنے آپ کو اسلامی نظام کا علمبردار قرار دیتے ہیں چوری کی شرعی حد کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں گے اور اسلام کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنانے کی بجائے اس کی ایسی تفسیر پیش کریں گے جس کے نتیجے میں شریعت اسلامی لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہو سکے۔ (اکتوبر ۱۹۹۱ء)



## چوری کی شرعی حد کے بارے غلط فہمی

وزیر اعظم پاکستان نے ۱۹ جولائی کو لاہور کے ہوائی اڈے پر شریعت بل کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ انسانوں کے ہاتھوں اور کانوں کو کاٹنا صحیح نہیں سمجھتی۔ حکومت کے مخالف علماء نے ان کے اس بیان پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے بارے میں جو کچھ ان کے منہ میں آرہا ہے کہے جا رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر غفور احمد جسے نسبتاً سنجیدہ سیاستدان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں انہوں نے بھی ایک سخت بیان جاری کیا ہے۔ انہوں نے اعضاء کاٹنے کی سزا کے بارے میں وزیر اعظم کے بیان کو اشتعال انگیزی اور حلف کی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔

ہمارے ہاں تمام دنیاوی معاملات میں کمال حاصل کرنے کیلئے علم کا حصول ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اسلام کے بارے میں ہم اس اصول پر عمل نہیں کرتے جس کے منہ پر جو کچھ آتا ہے وہ کہے جاتا ہے۔ پروفیسر غفور کے حوالے سے راقم کو ایک پینتیس سالہ پرانا واقعہ یاد آگیا۔ ان دنوں راقم اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کے اجتماعات میں درس قرآن دیا کرتا تھا۔ ایک اجتماع میں پروفیسر غفور بھی شریک ہوئے تھے۔ اس وقت وہ سٹیج ملز، اوکاڑہ میں کلرک کے طور پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے

درس کے دوران ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ راقم نے اس وقت انہیں مشورہ دیا تھا کہ سیاست کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا قرآن کا مطالعہ کر لیں اور آج پینتیس سال کے بعد ان کا بیان پڑھنے کے بعد انہیں پھر یہی مشورہ دوں گا۔ اگر اس بارے میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کا غور سے مطالعہ کر لیا ہوتا تو پھر انہیں اپنا موجودہ بیان دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

چوری کی شرعی حد کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ضروری محسوس کرتا ہوں کہ اس بات کا ذکر کر دیا جائے کہ اسلامی معاشرے میں شرعی حدود نافذ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا معاشرہ قائم کرنے کے بعد ہی شرعی حدود نافذ کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب ملک میں قحط پڑ گیا اور اسلامی حکومت مساوات پر مبنی معاشرے کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی حدود کے نفاذ کو معطل کر دیا تھا۔ انہی دنوں کچھ غلام چوری کے جرم میں پکڑے ہوئے ان کے پاس آئے۔ انہوں نے اپنے مالک کا اونٹ چرا کر اسے ذبح کر کے کھالیا تھا۔ مقدمے کی تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ ان کا آقا انہیں مناسب خوراک نہیں دے رہا تھا اور انہوں نے اپنی بھوک مٹانے کے لئے چوری کا یہ جرم کیا تھا۔ آپ نے غلاموں کو تو بری کر دیا ان کی بجائے ان کے مالک کو سزا دی کہ چونکہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ اس لئے وہ اس جرم کے ارتکاب پر مجبور ہو گئے۔

چوری اور ڈکیتی ایسے جرائم ہیں جن کے ذریعے دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈکیتی چوری سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے کیونکہ اس میں ڈاکہ ڈالنے والے بعض اوقات لوگوں کو جان سے مار دینے میں بھی باک محسوس نہیں کرتے۔ قرآن مجید میں اس جرم کو فساد فی الارض قرار دیتے ہوئے اس کی یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔

ترجمہ:- جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں آزادی سے محروم کر کے قید میں ڈال دیا جائے۔ (سورۃ المائدہ - ۳۳)

اس کے کچھ عرصہ بعد چوری کے بارے میں شرعی حد کے سلسلے میں یہ احکامات نازل ہوئے۔

ترجمہ:- اور چور چاہے وہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عبرتناک سزا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر غالب ہے۔ (المائدہ - ۳۸)

ڈکیتی کا جرم جیسا کہ واضح ہے، چوری سے زیادہ سنگین ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید میں تین سزائیں تجویز کی گئی ہیں، قید، ہاتھ کاٹنے اور پھانسی کی سزا ظاہر ہے ان میں قید کی سزا سب سے ہلکی ہے اور یہ اس وقت دی جائے گی کہ جب جرم کی نوعیت ابتدائی یا معمولی نوعیت کی ہوگی۔ جرم سنگین ہوتا جائے گا تو سزا بھی سنگین ہوتی جائے گی۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر جس نے اپنی زندگی برصغیر ہندوستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ انہوں نے چوری کے جرم کے ارتکاب پر ہاتھ کاٹنے کی بجائے صرف قید کرنا کافی سمجھا۔

انہوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پانچ صد علماء کو اکٹھا کیا تھا۔ جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کیا۔ جب یہ فتاویٰ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بہت سے معاملات میں علما سے اختلاف کیا۔ ان میں سے ایک چوری کی سزا کے بارے میں قانون تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں امام شافعی کا مسلک قرآن مجید کے زیادہ قریب ہے جو چوری کے مجرم کے لئے قید کی سزا تجویز کرتے ہیں اور اگر بد حال اور ان وہ تو یہ کر لے تو پھر اس کے جرم کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ امام شافعی کے اس فتویٰ کی روشنی میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے مندرجہ ذیل

فرمان نمبر ۳۳ جاری کیا۔

”کہ جب اسلامی قانون کے مطابق کسی پر چوری کا جرم ثابت ہو جائے، تو اسے قید کر دیا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ کرنے۔“

(مراة احمدی از مرزا محمد حسین مطبوعہ کلکتہ جلد اول صفحہ ۲۷۸) چنانچہ حنفی فقہاء کے فتویٰ کے برعکس، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے انہیں قید کرنے پر اکتفا کیا اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں کسی چور کے ہاتھ نہیں کاٹے تھے لیکن چونکہ مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ قائم کر دیا تھا، اس لئے چوری کے جرائم خود بخود کم ہو گئے۔ اگرچہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر جیسے روشن خیال حکمرانوں نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے انہیں قید میں ڈالنا ہی کافی سمجھا۔ لیکن ایسے حکمران بھی تھے کہ جنہوں نے قدامت پسند علماء کے فتاویٰ پر عمل کرتے ہوئے چوروں کے ہاتھ کاٹنے۔ مسلمان علماء کا ایک روشن خیال طبقہ جو تاریخ میں معتزلہ کے غلط نام سے مشہور ہے اس نے ہمیشہ ان کے اس کام کی مخالفت کی انہی میں سے ایک ابو الاعلیٰ معری تھے۔ انہوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اگر کسی مسلمان کا ہاتھ غلطی سے کٹ جائے تو اسے پچاس اونٹ یا پانچ صد دینار معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن ایک چوتھائی دینار کے لئے اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ بعض بادشاہوں نے اس حکم پر اس لئے بھی عمل کیا تھا کہ وہ اپنے مخالفوں پر چوری کا الزام لگا کر ان کے ہاتھ کٹوا دیتے تھے۔ ان معتزلہ علماء نے دعوے کیا کہ خود قرآن مجید کی تعلیمات کی رو سے چور کے ہاتھ کاٹے نہیں جاسکتے بلکہ قرآن مجید نے ہاتھ کاٹنے کا مطلب بھی خود واضح کر دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ سورۃ یوسف کے اس واقعہ سے استدلال کرتے تھے۔ کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے شہر کی عورتوں کو ایک دعوت پر بلایا اور ان کے ہاتھوں میں پھلوں کے کاٹنے کے لئے چھریاں دیں لیکن جب انہوں نے حضرت یوسف کو دیکھا تو انہوں نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے (سورۃ یوسف)

یہاں ہاتھ کاٹنے کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ پہنچوں سے علیحدہ کر دیئے تھے۔ بلکہ واضح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر ان پر زخم کر دیئے تھے۔ اس لئے فقہاء نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ اگر چوری کے مجرم کے ہاتھ پر ایسا زخم لگا دیا جائے کہ وہ مندمل ہو کر بھی واضح طور پر نظر آتا رہے تو یہ ہاتھ کاٹنے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ چور کے ہاتھ کا یہ نشان اسے اپنے جرم کا احساس بھی دلاتا رہے گا۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت کا احساس دلاتا رہے گا۔

شریعت اسلامی معاشرے سے چوری کے جرم کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ لوگوں کے ہاتھ کاٹ کر انہیں ایسا بے بس کر دیا جائے کہ نہ تو وہ اپنی صفائی کر سکیں اور نہ ہی نماز پڑھ سکیں بلکہ معاشرے پر بوجھ بن جائیں۔ حیرت کی بات ہے کہ جو بات آج سے تین سو سال پہلے سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی سمجھ میں آگئی تھی وہ اس روشنی کے دور میں اسلامی نظام کے علمبرداروں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ امید ہے کہ وہ ان گزارشات کی روشنی میں چوری کی شرعی حد کے بارے میں مختلف علمائے اسلام کے نقطہ نظر کا مطالعہ کر کے موجودہ دور کے لئے کسی مؤثر طریقے کی سفارش کریں گے۔

ہمارے ملک میں دس سال پہلے چوری کے بارے میں شرعی حد کا نفاذ کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے معاشرے پر خوشگوار کی بجائے اس کا منفی اثرات ڈالے ہیں اور چوری کے جرائم میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ شرعی حدود کا نفاذ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں کیا گیا تھا۔ اس لئے اگر ہمارے یہ بھائی خود وزیر اعظم پاکستان کے خلاف طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں مخلص ہیں تو پھر انہیں ملک میں مساوات پر مبنی اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ خیال رہے کہ اس معاشرے کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں زمین کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان اپنی ضرورت کے

مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے (بخاری جلد اول: ۷۱۸) (حامد اینڈ کوآئیڈیشن لاہور)  
 اگر ایسا معاشرہ قائم ہو جائے تو چوری کے جرائم خود بخود کم ہو جائیں گے۔

(جولائی ۱۹۹۰ء)



## دور رسالت اور خلافت راشدہ میں کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا تھا

چوری کی شرعی حد کے عنوان کے تحت راقم کا جو مضمون روزنامہ امروز کی ۲۵ جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے اس میں راقم نے ان مسلمان علماء کا قول نقل کیا تھا جن کے نزدیک چوری کے قطع ید سے مراد اس کے ہاتھ کو پنچے سے کاٹنا مراد نہیں ہے بلکہ اس پر ایسا کاری زخم لگانا مراد ہے کہ جو مندمل ہو جانے کے بعد بھی انہیں اپنے جرم کا احساس دلاتا رہے اس سلسلے میں انہوں نے سورۃ یوسف کی آیت ۳۱ سے استدلال کیا تھا کہ جب عزیز مصر کی بیوی کے حضرت یوسف سے معاشقے کی خبر شہر میں پھیلی تو شہر کی عورتوں نے اسے لعنت ملامت کرنا شروع کر دیا تھا۔ عزیز مصر کی بیوی نے ان کی لعنت ملامت کا جواب دینے کی بجائے انہیں ایک دعوت پر بلایا اور پھل کاٹنے کے لئے ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیں۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے لایا گیا تو وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئیں اور اسی حیرانی کے عالم میں انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے (آیت ۳۱) اب کوئی بھی مفسر اس آیت کا یہ معنی بیان نہیں کرتا کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ اپنے پنچوں



ت اُنہ کر لئے تھے بلکہ صرف یہی کہ انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر دیئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہاتھوں کو زخمی کرنے پر بھی قطع ید کا اطلاق ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ان علماء نے یہ دعویٰ کیا کہ خود دور رسالت اور خلافت راشدہ پر اسی اصول پر عمل ہوتا تھا ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اس بابرکت دور میں کسی چور کا ہاتھ پنچے سے نہیں کاٹا گیا تھا۔ اور جو علماء پنچے سے ہاتھ کاٹنے کے قائل تھے انہیں چیلنج کیا کہ اگر ان کے پاس اس بارے میں کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ خود امام بخاری کو اس بارے میں کوئی حدیث نہیں مل سکی۔ اس سلسلے میں انہوں نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک عمل سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے پنچے سے ہاتھ کاٹا تھا اور اس طرح یہ تسلیم کر لیا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے ثلاثہ سے کوئی روایت نہیں ملتی (صحیح بخاری اردو جلد سوم ۶۰۷ حامد اینڈ کو ایڈیشن) فقہ جعفریہ کے بانی امام جعفر صادق نے امام بخاری کی اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بہتان ہے ان کے نزدیک قطع ید سے مراد۔ ہاتھ کی دو چار انگلیوں کا کاٹنا ثابت ہے اس سلسلے میں وہ بھی قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں ارشاد ہے ویکتبون بایدھم یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ اب لکھا تو انگلیوں سے جاتا ہے اس لئے ان کے نزدیک قطع ید سے مراد ہاتھ کو پنچے سے کاٹنا مراد نہیں بلکہ صرف انگلیوں کا کاٹنا مراد ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کے بعد نماز اور دوسری عبادات بھی صحیح طریقے سے ادا کر سکے گا۔ انہی اس دلیل سے مایوس ہو کر ان حضرات نے مندرجہ ذیل حدیث کا سہارا لیا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

(ترجمہ) حضرت عبدالرحمن بن محرز سے روایت ہے کہ ہم نے فضالتہ بن عبید سے چور کے کئے ہوئے ہاتھ کو گلے میں لٹکانے کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ سنت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور کو لایا گیا ان کے ہاتھ کو کاٹا گیا پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کا کاٹنا ہوا ہاتھ اس کے

گلے میں لٹکا دیا جائے۔ (نیل الاوطار جلد ہفتم صفحہ ۱۲۲)

اس حدیث کے ساتھ ہی علامہ شوکانی نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی حجاج بن ارطاة تھا جو تمام محدثین کے نزدیک بالاتفاق جھوٹا تھا اس لئے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ (ایضاً)

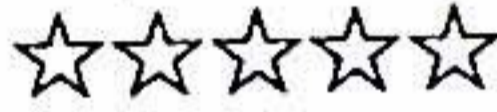
مختصر یہ کہ جو علمائے اسلام قطع ید سے مراد ہاتھ کو صرف زخمی کرنا مراد لیتے تھے ان کے چیلنج کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکا تو پھر اس سلسلے میں انہوں نے قرآن مجید کی سورہ یوسف سے استدلال کر کے قطع ید سے مراد جو ہاتھ زخمی کرنا مراد لیا ہے۔ تو وہ زیادہ صحیح قول معلوم ہوتا ہے۔

اب ان علماء حضرات کا طرز عمل دیکھئے کہ جنہوں نے ہاتھ کو پنچے سے کاٹنے پر اصرار کیا جب انہوں نے اس کے نتائج پر غور کیا تو انہوں نے چوری کی تعریف کے بارے میں ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ چور پر کسی صورت میں حد نافذ ہی نہیں ہوتی تھی۔ فقہ کی کتابوں میں چوری کے بارے میں تفصیلات کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی ایسی صورت باقی نہیں رہتی کہ چور کا ہاتھ کاٹا جاسکے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے ایک ارشاد نبوی سے استدلال کیا کہ ”ادرو الحدود بالشبہات“ کہ کسی معاملے میں ذرا سی بھی شبہ ہو تو شرعی حدود نافذ نہ کی جائیں ہمارے آج کل کے وکلاء حضرات تو مقدمات میں ایسے مین میخ نکالتے ہیں کہ وہ صحیح بات کو غلط ثابت کر دیتے ہیں چہ جائیکہ شبہ کا امکان ہو اس لیے موجودہ دور میں کسی چور کے سزا پانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمارے علماء نے جو یہ تفصیلات مرتب کی ہیں ان میں سے کچھ کی تفصیل فتاویٰ سے نقل کر کے قارئین کی خدمت میں ایک علیحدہ مضمون کی صورت میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ان تفصیلات کو سامنے رکھنے سے قارئین خود اس فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اسلامی فقہ جسے اسلامی قانون کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے اس میں چوری کی شرعی حد کے سلسلے میں جو تفصیلات پیش کی گئیں ہیں ان کی روشنی میں کسی چور پر

کبھی چوری کی شرعی حد کے نفاذ کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ بلکہ اگر چوروں کو ان تفصیلات کا علم ہو گیا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ اس جرم کا ارتکاب کرنے لگ جائیں گے کیونکہ ان احکامات میں چوری کے عجیب عجیب طریقے سکھائے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں روشن خیال مسلمان علماء جنہیں معتزلہ کہا جاتا ہے کا مسلک قرآن و سنت کے بھی قریب ہے اور اس سے معاشرے سے چوری کے واقعات ختم کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ بدنامی کا داغ ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کو جرائم کے ارتکاب سے روکتا ہے اور چوری کے جرم کی بدنامی کا داغ تو ہر دیکھنے والے کو ان مجرموں کے ہاتھوں پر نظر آئے گا۔ اسلام کا مقصد بھی یہی ہے کہ معاشرے کو اس برائی سے پاک کیا جائے اس سلسلے میں مختلف مسلمان علماء کی طرز عمل کو سامنے رکھا جائے تو معتزلہ کا طرز عمل زیادہ مؤثر دکھائی دیتا ہے۔ (اگست

(۱۹۰)



## شریعت اسلامی میں عورت کی دیت کا مسئلہ

عورت کی دیت کے مسئلہ پر اخبارات میں کافی عرصے سے بحث ہو رہی ہے اور مختلف طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے اہل علم اپنے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ معاملہ الجھتا جا رہا ہے اس مسئلہ میں کچھ سیاست بھی داخل ہو گئی ہے جس نے اسے مزید الجھا دیا ہے جس کی وجہ سے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اب یہ مسئلہ پھر قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا اور اس حوالے سے پر دوبارہ بحث شروع ہو چکی ہے۔ حالانکہ شریعت اسلامی کی دوسری تعلیمات کی طرح یہ مسئلہ بھی بڑا سادہ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں قرآن و حدیث سے اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلات قارئین امروز کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

شریعت اسلامی کا سب سے بڑا مصدر قرآن مجید ہے اس میں جتنے احکامات بیان ہوئے ہیں وہ مسلمان مردوں اور عورتوں پر یکساں نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً روزوں کی فرضیت کے بارے میں قرآن مجید میں صرف ایک آیت ہے جس میں خطاب مردوں سے ہے اب اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ کہ چونکہ اس آیت میں عورتوں کا ذکر نہیں۔ اس لئے ان پر روزے فرض نہیں کہ اس اصول کو اپنانے کی

کوشش کی گئی تو عام اسلامی تعلیمات مذاق بن کر رہ جائیں گی کیونکہ تقریباً تمام شرعی احکامات میں ذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید کی اصولی تعلیمات کے مطابق جو دیت مرد کی ہے وہی عورت کی ہے۔

لیکن اسے نصف ثابت کرنے کے لئے آیات وراثت سے استدلال کیا جاتا ہے کہ سورۃ النساء کی آیت گیارہ میں عورت کا صحیح نصف قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کی دیت بھی نصف ہونی چاہیے وراثت کے بارے میں اس آیت نمبر ۱۱ اور اس سے اگلی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ استدلال غلط قرار پاتا ہے آیت نمبر گیارہ میں عورت اور مرد کی وراثت کا ذکر نہیں بلکہ بیٹے اور بیٹی کے حصے کا ذکر ہے جس میں بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف قرار دیا گیا ہے اسی آیت میں ماں اور باپ کا حصہ برابر قرار دیا گیا ہے یعنی چھٹا حصہ حالانکہ ماں عورت ہے اور باپ مرد اسی طرح اگلی آیت میں بہن اور بھائی کا حصہ بھی برابر رکھا گیا ہے حالانکہ بہن عورت ہے بلکہ بعض صورتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں عورتوں کا حصہ مرد سے زیادہ بن جاتا ہے مثلاً اسی وراثت کی آیت نمبر ۱۱ میں مذکور ہے کہ اگر کسی کی اولاد نہ ہو اور وفات کے بعد اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی حصہ ملے گا جبکہ باپ کو چھٹا حصہ یہاں ماں جو عورت ہے کا حصہ باپ جو مرد ہی سے دوگنا قرار دیا گیا ہے ان تفصیلات سے یہ اصول باطل ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامی میں عورت کا وراثت میں حصہ مرد سے نصف ہے۔

قرآن مجید سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جو مرد کی دیت ہے وہی عورت کی۔ عورت کی دیت کے نصف ہونے کا حدیث میں بھی کوئی ذکر نہیں دراصل فقہاء نے جو اس بارے استدلال کیا ہے وہ قرآن و حدیث سے نہیں بلکہ حضرت سعید بن المسیب کی ایک وضاحت سے ایسا کیا ہے وضاحت یہ تھی کہ مشہور فقیہ ربیعہ بن عبدالرحمن جو اپنے زمانے میں قیاس کے علمبردار تھے نے حضرت سعید بن المسیب سے عورت کی انگلیوں کی دیت کے بارے میں دریافت کیا آپ نے ایک

انگلی کی دیت دس اونٹ، دو کی بیس اونٹ، تین کی تیس اونٹ اور چار کی بیس اونٹ بتائی اس پر ربیعہ نے کہا کہ چار انگلیوں کے نقصان کی صورت میں جرم کی سنگینی بڑھ گئی ہے اس لئے سزا میں اضافہ ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس اس میں کمی کر دی گئی ہے تو اس پر سعید بن المسیب نے فرمایا کہ سزا میں یہ کمی سنت کے مطابق ہے۔ (نیل الاوطار جلد ہفتم صفحہ ۷۱)

اس کی تائید میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پیش نہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ دور رسالت میں عورت کی دیت کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوا اور عام طریقہ یہ تھا کہ جن مسائل کے بارے میں رسول اللہ کے زمانے میں کوئی نظیر نہ ملتی تو علمائے اسلام اس علاقے کے معمول پر عمل کرتے جسے سنت کہا جاتا تھا مدینہ منورہ میں عورت کی دیت زمانہ جاہلیت میں مرد سے نصف قرار دی جاتی ہوگی اس لئے حضرت سعید بن المسیب نے اس کے مطابق فتویٰ دے دیا اس کی تائید میں انہوں نے قرآن یا حدیث کے سے کچھ نہ فرمایا۔ ہمارے فقہاء کی اکثریت نے ان کی اس رائے کو قبول کر لیا۔ تاہم بعض فقہاء ایسے بھی تھے جنہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سرفہرست قاضی ابوبکر اصم اور قاضی ابن علیہ خاص طور پر مشہور ہیں انہوں نے قرآنی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کی دیت مراد کے برابر ہے۔

(نیل الاوطار جلد ہفتم صفحہ ۷۳)

خود وہ فقہاء اور علماء کہ جنہوں نے عورت کی دیت مرد کے نصف قرار دی ہے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی رو سے یہ برابر ہے لیکن اس کے باوجود یہ استدلال فرماتے ہیں کہ چونکہ فقہاء کی اکثریت نے سعید بن المسیب والا مسلک اختیار کر لیا ہے اس لئے اس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی مولانا ظفر احمد عثمانی اس بارے میں یہ استدلال فرماتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم مرد اور عورت کی دیت کی مساوات بتا

رہا ہے لیکن ہم نے عورت کے معاملے میں آیت کو اپنے ظاہری مفہوم سے آثار اور  
اجماع فقہاء کی وجہ سے موڑ لیا ہے۔“

(اعلاء السنن جلد ۱۸ صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ کراچی)

ان تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فقہاء نے  
قرآن مجید سے استدلال کرنے کی بجائے حضرت سعید بن المسیب کے فتویٰ کو اختیار  
کر لیا تھا۔ خیال رہے کہ یہ حضرت سعید بن المسیب وہی بزرگ ہیں جو عید الاضحیٰ  
کے دن قربانی کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ جو مسلمان قربانی  
کرنا چاہتا ہو تو وہ قربانی کے عوض اس کی قیمت سے کسی غریب کی ضرورت پورا  
کردے تو زیادہ اچھا ہے۔ (محل خرم جلد ہفتم صفحہ ۳۸۸)

لیکن عجیب بات ہے کہ ہمارے فقہاء نے دیت کے بارے میں تو حضرت سعید  
بن المسیب کا قول لے لیا ہے لیکن قربانی کے بارے میں ان کے مشہور مسلک کا کبھی  
ذکر نہیں کیا۔ ان تفصیلات کی روشنی میں اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ قرآن  
مجید کی سادہ تعلیمات پر غور فرمادیں ان پر واضح ہو جائے گا۔ قرآن و حدیث کے  
مطابق مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں۔ (ستمبر ۱۹۸۳ء)



## اسلامی شریعت اور انسانی اعضاء کی پیوند کاری

پچھلے سال پڑوسی ملک سری لنکا سے بھیجی ہوئی انسانی آنکھوں کو اپریشن کے ذریعے ایک صد پاکستانی نابیناؤں کو آنکھوں میں پیوند لگا کر ان کی بینائی بحال کر دی گئی تھی انسانی زندگی کو موت اور اذیت ناک مصائب سے بچانا، تاریخ اسلامی کے ہر دور میں، قابل تعریف فریضہ سمجھا گیا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا، خون کے انتقال کا مسئلہ ہے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے لاکھوں انسان، خون کی کمی، خصوصاً لڑائیوں میں بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے لقمہ جل ہو جاتے تھے۔ لیکن انسانی علم نے ترقی کی اور ماہرین علم طب نے جن میں امریکی سرجن مسٹر کرائل اسکندے نیویا کے ڈاکٹر جینکی اور ڈاکٹر موس کے نام سرفہرست ہیں ایک انسان کا خون، دوسرے انسان میں منتقل کر کے میڈیکل سائنس میں انقلاب برپا کر دیا۔

اسلام نے ایک بھی انسانی جان کو ہلاکت و بربادی سے بچانے کو ایک بہت بڑی نیکی اور تمام انسانیت کے ساتھ احسان قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۳ میں ارشاد ربانی ہے کہ جس نے ایک انسانی جان کو ہلاکی ہونے سے بچایا، اس نے گویا ساری انسانیت کو بچالیا۔ ایک انسان کے خون کو دوسرے انسان میں منتقل کرنے کی ضرورت، صرف اس وقت پیش آتی ہے جب اس انسان کی زندگی کو خطرہ ہو۔ بعض



اوقات تو بلاست کا یہ خطرہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ چند منٹوں کے توقف سے، زخمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے اسے حالت اضطرار یعنی مجبوری کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس حالت میں ایسی حرام چیزوں کو بھی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے جنہیں شریعت اسلامی میں بڑے واضح الفاظ میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس جانور کو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جائے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن جو شخص مجبور ہو جائے نہ زیادہ چاہنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا، اس پر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ قرآن حکیم نے یہاں اس امر پر کوئی تخصیص نہیں کی کہ یہ خون انسانوں کا ہو گا یا حیوانوں کا۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ہمارے علماء اس کا یہ فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسانی جسم کے لئے نقصان دہ ہیں۔ لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود قرآن حکیم مجبوری کی حالت میں جان بچانے کے لئے ان تمام ناجائز چیزوں کے استعمال کو جائز قرار دیتا ہے۔ تمام فقہی مذاہب نے اس قرآن اجازت کو تسلیم کیا ہے۔

بلکہ بعض فقہانے تو غیر اضطراری حالت میں بھی ان حرام چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری کا یہ فتویٰ ملاحظہ ہوا۔

”اگر بیمار کو کسی مسلمان طبیب نے خبر دی کہ تیری شفا خون یا پیشاب پینے یا مردار خانے میں ہے اور اس نے ان مباح چیزوں میں سے اس کے قائم مقام کوئی چیز نہ پائی تو اس کو پینا اور کھانا جائز ہے۔“

(فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ شیخ غلام علی جلد نہم صفحہ ۹۸)

اضطراری کیفیت یا مجبوری کا جواز جان بچانے تک محدود ہے لیکن ہمارے فقہاء تو جلدی صحت حاصل کرنے کے لئے بھی ان حرام چیزوں کو حلال قرار دیتے

ہیں۔ خون پینا تو اکثر صورتوں میں صحت کے لئے نقصان دہ ہے جبکہ اس کے مقابلے میں خون کو آلات کے ذریعے منتقل کرنے میں ایسے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں۔ اس لئے اس کی اجازت بوجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔

مسلم حنبلی کے مشہور امام ابن قدامہ نے تو جان بچانے کے لیے حرام چیزوں کے استعمال کو فرض قرار دیا ہے۔ ان کے فتویٰ کے مطابق جو شخص اس شرعی اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مجرم قرار پائے گا اور قیامت کے دن اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا فرماتے ہیں۔

عبداللہ سے ایسے مجبور شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ جسے جان بچانے کے لئے مردار کا گوشت دستیاب تھا لیکن اس نے نہ کھایا تو انہوں نے حضرت مسروق کا یہ قول نقل کیا کہ جس شخص کی حالت بھوک کی وجہ سے اضطراری تھی اور اس نے مردار کا گوشت نہ کھایا۔ اور نہ کوئی حرام چیز لی۔ اور اسی حالت میں مر گیا۔ تو وہ قیامت کے دن دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور یہی ابن حامد کی رائے ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور ایسی حالت میں مردار کے کھانے کو ترک کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

(المغنی لابن قدامہ جلد ہشتم صفحہ ۵۹۶)

اعضاء کی پیوند کاری کا مسئلہ خون کے انتقال سے بھی زیادہ اہم ہے۔ علم طب اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ مردہ انسانوں کے اعضاء زندہ انسانوں کے اعضاء سے بدل دیئے جاتے ہیں۔ آج سے ۶۰، ۷۰ سال پہلے مصر میں علماء کی ایک مجلس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ علامہ رشید رضا نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اعضاء کی پیوند کاری کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ فقہائے کرام نے اسے صدیوں پہلے حل کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے انہوں نے انسانی اعضاء کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دے دی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچ

تھے۔ اس کی تائید میں انہوں نے امام ابن قدامہ کا یہ فتویٰ پیش کیا کہ مردہ انسان کے تمام اعضاء کی فروخت جائز ہے۔ کیونکہ غلام اور لونڈی کی فروخت جائز ہے اور آزاد آدمی کی فروخت اس لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں اور زندہ انسان کے کاٹے ہوئے عضو کی فروخت کی بھی اجازت نہیں، کیونکہ اسے کوئی نفع نہیں ہوتا۔“

(المغنی لابن قدامہ جلد چہارم صفحہ ۲۶۰)

علامہ رشید رضا نے اس معتبر کتاب کو زمانہ جدید کے معیار تحقیق کے مطابق دوبارہ مرتب کر کے شائع کر دیا تھا اس فتویٰ کے نیچے یہ لکھتے ہیں۔

”یعنی انسان کے اعضاء کی فروخت اس وقت جائز ہے جب ان سے نفع اٹھایا جائے۔ اور یہ ہمارے زمانے میں ممکن ہے۔ جبکہ جلد سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اس سے بدن کے دوسرے حصے میں پیوند کاری کر دی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مردہ جسم کے کسی حصے کو کاٹنا، اس کی بے حرمتی کرنا ہے، لیکن خود حنفی فقہ میں، بعض ایسی مثالیں موجود ہیں۔ جو اس اعتراض کی نفی کرتی ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں مذکور ہے۔

فتاویٰ ابواللیث میں مذکور ہے کہ عورت مرگئی وہ حاملہ تھی اور یقین ہو کہ اس کے پیٹ کا بچہ زندہ ہے تو عورت مذکور کا پیٹ، بائیں طرف سے چاک کیا جائے، اس طرح اگر گمان غالب ہو تو اس کے پیٹ کا بچہ زندہ ہے تو بھی یہی حکم ہے یہ محیط میں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد نہم صفحہ ۱۰۷)

اس فتویٰ کے مطابق ایک انسانی جان کہ جس کی زندگی کا پورا یقین نہیں، اسے بچانے کے لئے مردہ کا عضو کاٹنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے برعکس فقہائے کرام نے ایک زندہ انسان کو بچانے کے لئے کسی ایسے مردہ نفس کہ اس کی موت کا پورا یقین بھی نہیں، کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ فتویٰ

ہی عائلی ہی سے ملاحظہ ہو۔

اگر کسی حاملہ کے پیٹ میں بچہ معترض ہو گیا، یعنی بینڈا ہو کر، چوڑان میں پڑ گیا اور لوگوں کو بچہ نکالنے کی کوئی راہ نہ معلوم ہوئی۔ سوائے اس کے کہ بچے کے عضو جدا کر دیئے جائیں۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ماں کی جان کا خوف ہے تو مشائخ نے فرمایا کہ اگر بچہ پیٹ کے اندر مر گیا تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (ایضاً)

اس فتویٰ کے مطابق ایک زندہ جان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے مردہ نفس کی اجازت کے بغیر اس کے اعضاء کاٹنے اور ٹکڑے کرنے کی اجازت ہے۔ اس زمانے میں میڈیکل سائنس نے مصیبت زدہ انسانوں کو دائمی دکھ اور تکلیف سے بچانے کے لئے انسانی اعضاء کی پیوند کاری کا طریقہ رائج کیا ہے۔ پھر اس امر کا دائرہ کار صرف ان مردہ انسانوں تک محدود ہے جو اپنی موت سے قبل انسانیت کے نفع کے لئے اپنے جسم کے بعض اعضاء دوسرے انسانوں کی مصیبتیں دور کرنے کے لئے استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ اعضاء ویسے بھی موت سے چند دنوں کے بعد فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مرنے والے نے اپنے عطیے سے کسی دوسرے قریب المرگ انسان کو زندہ رکھنے میں مدد دی تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضرور اجر کا مستحق ہوگا۔

(اپریل ۱۹۸۳ء)



## ہیروئن کی آمدنی سے یورپ میں تبلیغ دین

پچھلے کئی سالوں سے ہمارے ملک سے علماء حضرات کی ایک کثیر تعداد اسلام کی تبلیغ کے لیے یورپ کے مختلف ممالک کے دورے کر رہی ہے۔ ان میں اکثر علماء کو راقم ذاتی طور پر جانتا ہے وہ انگریزی زبان جو یورپ میں تبلیغ اسلام کے لیے بنیادی شرط ہے کا ایک لفظ تک نہیں جانتے۔ ان کے مقابلے میں ایسے کئی علماء موجود تھے جو انگریزی زبان پر مناسب دسترس رکھتے تھے لیکن یورپ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے کسی نے ان کی خدمات حاصل نہ کیں۔ خود راقم کو اس کام سے کافی دلچسپی تھی اور اسی کام کے ایک حصے کے طور پر تیس سال سے مختلف اسلامی موضوعات پر انگریزی اخبارات میں کالم لکھ رہا تھا لیکن کسی ادارے نے راقم کو اس اسلامی خدمت کا موقع نہ دیا۔

دو سال پہلے ہمارے علاقے کے ایک مولوی صاحب قاری محمد اشرف صاحب جو لاہور کی ایک مسجد کے امام تھے، اچانک غیب کر دیئے گئے۔ یہ مولودی صاحب بھی، اسلام کی تبلیغ کے لیے یورپ کے مختلف ممالک کے دورے کر چکے تھے۔ حالانکہ انگریزی زبان کا ایک لفظ تک نہیں جانتے تھے۔ بلکہ اسلام کے بارے میں بھی ان کی معلومات واجبی ہی تھیں۔ چونکہ میانوالی میں ہمارے محلے کے امام مسجد سے ان کی نسبت ۱۰ اری تھی اس لیے ان سے اکثر ملنا ہوتا تھا تاہم میرے سامنے وہ یورپ میں اسلامی تبلیغ کے دوروں کی مطلقاً کوئی بات نہیں کرتے تھے بلکہ پوچھنے پر

بھی ٹار مٹول کر جاتے تھے ایک دن لاہور کی ایک پر رونق سڑک سے وہ اچانک غائب کر دیئے گئے۔ ان کی گاڑی گلبرگ میں ایک جگہ مل گئی جس میں ان کے سفر کے کاغذات موجود تھے۔ انہوں نے غالباً گلے دن اسلام کی تبلیغ کے لیے ہانگ کانگ جانا تھا کہ اس سفر سے پہلے اچانک بھرے بازار سے غائب کر دیا گیا۔ ان کے غائب ہونے کا معمہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ اس سلسلے میں مختلف لوگوں سے باز پرس ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ علاقائی تعلق کی وجہ سے راقم بھی ان کو گمشدگی کے معاملے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ ان کی گمشدگی کی اطلاع دینے والوں کے لیے ایک لاکھ روپے کا انعام بھی مقرر ہو چکا تھا۔ اس قسم کے انعام کے لالچ کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں کو پولیس پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے لیکن ہمارے قاری صاحب کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

اتفاق سے ایک مجلس میں ایسی باتیں سننے کا موقع ملا جس سے راقم کو اپنے قاری صاحب کی گمشدگی کا معہ حل کرنے میں مدد ملی۔ اس مجلس میں ان ذرائع پر بحث ہو رہی تھی کہ جن کے ذریعے یورپی ممالک بلکہ سعودی عرب میں ہیروئن سمگل کی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک ذریعہ تبلیغ اسلام کے لیے مولوی حضرات کے دورے بتائے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس مقصد کے لئے سب علماء حضرات کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان میں سے چند قابل اعتماد حضرات سے یہ خدمت لی جاتی تھی اور بعض دوسرے علماء جنہیں اس مقصد کے لیے استعمال لیا جاتا تھا۔ انہیں اس امر کی خبر تک نہ ہوتی کہ انہیں ہیروئن لے سمگل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ علماء حضرات کے ذریعے ہیروئن سمگل کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ جس دورے میں ہیروئن سمگل کرنے کا دھندا کیا جاتا۔ اس میں دو تین علماء حضرات کو شامل کیا جاتا۔ ان میں سے ایک دو حضرات کی ہوائی اڈوں پر خوب چیکنگ کرائی جاتی اور اس مقصد کے لیے ایسے طریقے استعمال کئے جاتے جنہیں عام طور پر غیر شریفانہ سمجھا جاتا۔ چونکہ ان حضرات کے سامان سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوتی تو

اس کے حوالے سے ان غیر ممالک کے ہوائی اڈوں کے ملازمین کو خوب جھاڑ پلائی جاتی کہ انہوں نے اس طرح کی چیکنگ کر کے ہمارے علماء پر بد اعتمادی کا اظہار کیا ہے اور ان کی بے عزتی کی ہے۔ یہ پارسل لوگ ہیں ایسے کام نہیں کرتے خیال رہے کہ یورپ کے لوگوں کو لگتا ہی ہے دین کیوں نہ سمجھا جاتے۔ وہ اپنے پادریوں کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ ویسے جی عام طور پر ان کے پادری دوسرے شہریوں کی نسبت پائیزہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ذراٹے کے بعد ہمارے سمگلر دوسرے علماء کو جن کے سامان میں ہیروئن ہوتی ہے بغیر چیکنگ کے ہوائی اڈے سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذریعے ہیروئن سمگل کی جاتی ہے۔

علماء حضرات کے ذریعے ہیروئن کی سمگلنگ کا دوسرا طریقہ یہ بتایا گیا کہ سمگلروں کے مختلف گروپ بعض علماء کا اعتماد قائم کرانے کے لیے دوسرے گروپ کے سمگلروں کو گرفتار کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسی اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ہیروئن سمگل کرتے ہیں ان تفصیلات کو سننے کے بعد راقم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یورپ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے نیم تعلیم یافتہ علماء جنہیں انگریزی زبان کا ایک لفظ تک نہیں آتا، کی خدمات کیوں حاصل کی جا رہی ہیں۔

پچھلے پندرہ سالوں میں انگریزی اخبارات میں اسلام کے بارے میں سب سے زیادہ کالم راقم کے شائع ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ سے جو پادری حضرات پاکستان تشریف لاتے ہیں وہ راقم سے ملاقات کر کے جاتے ہیں۔ چند سال پہلے یورپ کے مشہور پادری مسٹر ہانس کنگ بنوں نے پوپ کی اتھارٹی کو چیلنج کر رکھا ہے پاکستان تشریف لائے تو راقم سے ملاقات کے لئے غریب خانے پر تشریف لائے تو راقم حیران تھا کہ یورپ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے وفود میں ان پڑھ علماء کو شریک کیا جا رہا ہے لیکن اس قسم کی دعوت سے راقم محروم رہا۔ خود اتنی ہمت نہ تھی کہ یورپ کے دونوں طرف کا کرایہ تو کجا، ایک طرف کا کرایہ برداشت کر لیتا۔ اتفاق سے راقم اپنے کاموں میں ان بدبیانت اہل وطن کو بھی بے نقاب کر چکا تھا۔ جو ملک

کی دولت لوٹ کر سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کر رہے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہی لوگ تو علماء حضرات کے یورپ کے دوروں کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ تم انہیں بے نقاب بھی کرتے ہو اور یہ توقع بھی رکھتے ہو کہ وہ میرے یورپ کے دورے کے اخراجات بھی برداشت کریں۔ یہ کیسے ممکن ہے!

مجھے اس سارے معاملے کے بارے میں حیرت اس وقت ہوئی کہ جب اس کاروبار میں ملوث ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ وہ دین اسلام کی ہر خدمت دیانتداری سے کرتے ہیں۔ میرے لیے ہیروئن کی آمدنی سے دین کی خدمت کا دعوے ایک انوکھی بات تھی کیونکہ شریعت جس چیز کو حرام قرار دیتی ہے حرام آمدنی سے اسلام کی تبلیغ کا قصور انوکھا ہے۔

ہمارے ملک سے جو حضرات اسلام کی تبلیغ کے لیے یورپ کے دوروں پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان سے اگر وہ اسلام کی تبلیغ کے بارے میں مخلص ہیں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان دوروں پر جاتے وقت وہ اس امر کا اطمینان کر لیں کہ ان کے دوروں کے اخراجات کون لوگ برداشت کر رہے ہیں اگر انہیں یقین ہو جائے کہ یہ اخراجات ہیروئن کو سمگلر برداشت کر رہے ہیں تو انہیں ایسے دوروں سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے اسلام یورپ میں بدنام ہو گا جیسا کہ مجھے بتایا گیا کہ اس کاروبار کا بہت سے علماء کو علم تک نہیں ہوتا اور انہیں ہیروئن کی سمگلنگ کیلئے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ علم حضرات کو اس سلسلے میں باقاعدہ اعتماد میں لیا جاتا ہے میرا اندازہ ہے کہ ہمارے علاقے کے قاری اشرف کا شمار ایسے ہی علماء میں سے تھا اس لئے ان حضرات کو ان کے انجام کو سامنے رکھنا چاہیے اور اس حرام کاروبار سے ہر طرح سے لاتعلقی کا اظہار کر دینا چاہیے۔ دین اسلام کا رکھوالا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی تبلیغ کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی مہیا فرمائیں گے اس کیلئے حرام ذرائع آمدنی سے ہر صورت میں اجتناب کی ضرورت ہے۔ (مرقوم فروری ۱۹۹۰ء)



## کیا اسلامی مملکت کے حکمران شرعی سے حدود بالا ہیں

امروز میں میرے مضمون کی اشاعت کے جواب میں مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری اور سید غلام مصطفیٰ بخاری نے مختلف روزناموں میں ملے جلے جذبات کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے زیادہ تر اسلامی حکمران کے شرعی حدود سے بالاتر ہونے کے بارے میں بحث کی ہے۔ اپنے مضمون میں راقم نے فتاویٰ عالمگیری کا متعلقہ ضابطہ نقل کرنے کے بعد علماء حضرات سے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا وہ موجودہ دور کے مسلمان حکمرانوں کو بھی اس قسم کے حقوق دینے کو تیار ہیں کہ قتل کے علاوہ وہ جو ظلم و بد معاشی کریں مثلاً شراب نوشی، زنا کاری، چوری چکاری وغیرہ تو ان پر شرعی حدود کا نفاذ نہ ہوگا۔ مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری صاحب نے اس کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے اس کی تائید میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

چونکہ سربراہ مملکت انتظامی معاملہ میں خدا تعالیٰ کا سب سے بڑا نوکر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے خدا کا نائب ہے۔ لہذا حدود میں وہ خدا تعالیٰ کے باں خود ہی جواب دہ ہوگا کہ یہ اس کے حقوق ہیں۔ ماتحت لوگوں کو اس قسم کی تانیوں پر صبر کرنا ہوگا اور اس میں وہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے (نوائے وقت لاہور ۲۴: ۷۹) حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابو حنیفہ ساری عمر اپنے دور کے

مسلمان حکمرانوں کو تائبوں کی ڈٹ کر مخالفت کرتے رہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ حصہ جیل خانوں میں گزارا اور جیل خانے میں ہی وفات پائی مفتی صاحب کے اس ارشاد کے مطابق نہ تو انہوں نے صبر سے کام لیا اور نہ ہی اپنے آپ کو اس اجر عظیم کا مستحق قرار دیا جس کی طرف مفتی صاحب اشارہ فرما رہے ہیں۔ بلکہ جو لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے۔ ان پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا حنفی فقہ کی مشہور کتاب احکام القرآن جلد دوم مصنفہ قاضی ابوبکر حصاص میں آپ کا یہ مسلک تفصیل سے بیان ہوا ہے حکام وقت کے بارے میں جب رفقاء انہیں نرم رویہ اختیار کرنے کے لئے کہتے تھے تو آپ ہمیشہ اس حدیث نبویؐ کو ان کے سامنے پیش کرتے جو حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب تمام شہدا کے سردار ہیں اور ان کے بعد اس شہید کا درجہ ہے کہ جس نے ظالم حکمران کی مخالفت میں ثابت قدمی سے کام لیا اور اس کے احکام ماننے سے انکار کرنے پر اسے قتل کر دیا گیا (صفحہ ۴۱) حضرت ابو سعید الخدری کی روایت سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے ارشاد مبارک کا حوالہ دیا کرتے کہ سب سے افضل جہاد ظالم سلطان کے آگے کلمہ حق کہنا ہے (ایضاً) لیکن اس کے برعکس مفتی صاحب اس ظلم پر مسلمانوں کو صبر کی تلقین فرما کر انہیں اجر عظیم کا حقدار قرار دے رہے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ کن لوگوں کا مسلک تھا اور اس نے ان کی تصریح کے مطابق امت مسلمہ کو کتنا نقصان عظیم پہنچایا۔ اسی احکام القرآن میں لکھا ہے کہ یہ عقیدہ الخسویہ کا تھا۔ الخسویہ اہل حدیث کا ایک طبقہ تھا جو شریعت کے ظاہری الفاظ پر بے سوچے سمجھے اصرار کرتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مسلمان حکمران کتنے ہی ظلم و جور کا مرتکب ہو، اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی جائے ہاں اگر اس سے کمتر درجے کے لوگ ایسا کریں تو پھر زبان اور ہاتھ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ امام صاحب کے خیال کے مطابق ایسا عقیدہ رکھنے والے لوگ

امت مسلمہ کے لئے دشمنوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوئے کیونکہ انہوں نے عامتہ الناس کو مسلمان حکمرانوں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں پر فاسق، فاجر بلکہ مجوسی اور دشمنان اسلام لوگ چھا گئے۔ جس کے نتیجے میں دشمنوں نے مسلمانوں کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ہر طرف ظلم کا دور دورہ شروع ہو گیا اور مسلمان نہ دین کے رہے نہ دنیا کے یہاں تک زندیقوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ (جلد دوم صفحہ ۴۰)

یہ تو تھا امام ابو حنیفہ کا مسلک جو حنفی فقہ ہی کی ایک معتبر کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ایک دوسرے مضمون نگار سید غلام مصطفیٰ بخاری مسلمان حکمرانوں کو شرعی حدود سے بالاتر قرار دینے کے بارے میں ہفت روزہ افق کراچی میں عقلی دلائل دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور ثانیاً جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ اجرائے حدود کے لیے حاکم مجاز کا ہونا ضروری ہے تو چونکہ ریاست کا حاکم اعلیٰ خود ہی سب سے بڑا صاحب اختیار ہے لہذا اس کا خود پر اجراء ناممکن ہے اور شرعاً بھی معتبر نہیں ہے۔ اب آجا کر یہی صورت باقی رہتی ہے کہ بذریعہ قاضی اس کو قبول اجراء حدود پر مجبور کیا جائے۔ تو قاضی اس کے لیے حاکم مجاز نہیں ہے بوجہ ماتحت ہونے کے۔ کیونکہ وہ حاکم اعلیٰ ہونے کے ناطے کسی بھی وقت معزول کر کے بے اختیار کر سکتا ہے لہذا اس کے اختیارات مشکوک ہیں۔ حاکم اعلیٰ کے لیے اور اجرائے حدود کے لیے اختیارات کاملہ یقینیہ ضروری ہیں۔ ورنہ وہ حاکم مجاز نہیں کہلا سکے گا۔ اس لیے اس صورت پر اعتراض عقل پر ماتم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اگر عقل سے اتنا کام بھی نہ لیا جائے تو پھر صد حیف ایسی عقل پر۔“

جن صاحب نے یہ تراشہ ارسال فرمایا ہے انہوں نے اس سے بھی زیادہ ثقیل زبان استعمال کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ صرف گدھے ہی اس معمولی سے اسلامی قانون کو نہیں سمجھ سکتے۔ راقم تو شاید گدھے سے بھی گھٹیا انسان ہو لیکن ان نصرت و

ایسے ارشادات منہ سے نکالنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے یہ غور و فکر کر لینا چاہیے۔ کہ ان کے ارشادات کی زد کہاں کہاں تک جا کر پڑتی ہے! حضرات امام ابو حنیفہ کا مسلک تو راقم نے ادھر نقل کر دیا ہے۔ شراب خوری اور زنا کاری تو کجا وہ تو مسلمان حکمرانوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔ جس کے لیے انہیں اپنی عمر عزیز کا اکثر حصہ جیل خانوں میں گزارنا پڑا۔ دوسرے فقہی مذاہب کے بانیوں کا بھی یہی مسلک تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل کو جو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تو وہ کوئی بلا وجہ نہیں تھا۔ راقم امت مسلمہ کی آٹھواں زندہ فقہی مذاہب کی اکثر فقہی کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہے۔ حنفی فقہ کے کچھ فقہاء کے سوا کسی نے مسلمان حکمرانوں کو شرعی حدود سے بالا تر نہیں قرار دیا۔ خیال یہ ہے کہ یہ صدر اسلام کے زمانے کی بات ہو رہی ہے جس پر بارہ تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اور عام اخلاق پہلے کی نسبت پست ہو چکے ہیں۔ اس لئے راقم نے یہ استفسار کیا تھا کہ کیا ہمارے علماء آج کل کے مسلمان حکمرانوں کو اس قسم کے حقوق دینے کو تیار ہیں۔ راقم نے حاشا و کلا فتاویٰ عالمگیری پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا تھا۔ لیکن بخاری صاحب نے میرے اس سوال کا فتاویٰ عالمگیری پر اعتراض قرار دیا۔ بخاری صاحب کو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اب انہوں نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ کہ وہ آج کے مسلمان حکمرانوں کو بھی شرعی حدود سے بالا تر قرار دینا چاہتے ہیں۔ تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ اس پر مجھ جیسے گمنام آدمی کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے ہاں اگر یہ حضرات موجود دور کے مسلمان حکمرانوں کو اس قسم کے حقوق دینا جائز سمجھتے ہیں تو پھر انہیں سابقہ حکمرانوں کے خلاف چلائی ہوئی تحریک کے بارے میں کچھ فقہی توجیہ کرنی پڑے گی۔ اسلامی قانون کے بارے میں راقم کا نقطہ نظریہ ہے کہ اہل علم اس پر کھلے دل سے بحث کریں۔ اور حق بات سامنے آنے پر اسے تسلیم کر لیں۔

چاہے وہ فتاویٰ عالمگیری کا نفاذ ہی کیوں نہ ہو۔ (فروری ۱۹۷۹ء)

## عورت حکمران بھی بن سکتی ہے اور قاضی اور کمانڈر انچیف بھی

ان دنوں قومی اخبارات میں اس مسئلہ پر بحث چھڑی ہوئی ہے کہ کیا ایک مسلمان عورت کسی اسلامی ملک کی سربراہ بن سکتی ہے۔ یا نہیں۔ ہمارے کچھ سیاسی قسم کے علماء نے ایک کمزور۔ حدیث کا سہارا لیتے ہوئے۔ اس کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے۔ لیکن اس بارے میں انہوں نے قرآن و حدیث کے ان واضح احکامات کو سامنے نہیں رکھا، جس میں واضح طور پر عورت کو سربراہ مملکت بنانے کی اجازت موجود ہے۔ آئندہ سطور میں اس بارے میں اسلامی تعلیمات قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان تعلیمات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس حدیث کی حیثیت کا تعین کیا جائے کہ جس کا سہارا ہمارے یہ علماء لے رہے ہیں۔ اس حدیث کا پورا متن یہ ہے۔

عثمان بن ایشم نے عوف سے انہوں نے الحسن سے اور انہوں نے ابو بکر سے روایت کیا ہے کہ مجھے جنگ جمل کے دوران حضور صلعم کے اس قول سے اطمینان ہوا کہ جب ایرانیوں نے اپنے بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنا لیا۔ تو آپ نے

فرمایا کہ جس قوم نے عورت کو اپنا حکمران بنا لیا وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔ صحیح بخاری  
کتاب الفتن (حامد اینڈ کو ایڈیشن جلد سوم صفحہ ۷۳۹)

اس حدیث کے چار راوی ہیں اور چاروں کے چاروں آئمہ حدیث کے  
نزدیک کسی نہ کسی وجہ سے کمزور اور ضعیف آدمی تصور کئے جاتے ہیں۔ اس کے  
پہلے راوی عثمان بن الیشتم کے بارے میں اگرچہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سچا شخص  
تھا، لیکن روایات بیان کرنے میں بہت زیادہ غلطیاں کیا کرتا تھا۔

(میزان الاعتدال از علامہ ذہبی جلد سوم صفحہ ۵۹)

جھوٹی روایات کو سچا ثابت کرنے کے لیے عام طور پر اس قسم کے راویوں کا  
سہارا لیا جاتا تھا۔ اور اس امر کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے۔ کہ اس حدیث  
کو دوسرے تینوں راوی بھی آئمہ حدیث کے مقرر کردہ اصولوں کی صحت کے معیار پر  
پورے نہیں اترتے۔ دوسرے راوی جناب عوف ہیں، ان پر یہ الزام تھا کہ وہ شیعہ  
تھے اور قدری مسلک رکھتے تھے۔ ان دونوں خصوصیات کی وجہ سے ایسے راویوں کو  
ضعیف سمجھا جاتا تھا۔ (ایضاً جلد سوم صفحہ ۳۰۵)

اس حدیث کے تیسرے راوی الحسن ہیں عام طور پر راویوں کے والدین کا ذکر  
ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں صرف ایک راوی جس کی تفصیل ادھر گزر  
چکی ہے کے والد کا ذکر کیا گیا، باقی کسی راوی کے والد کا نام نہیں بتایا گیا۔ الحسن نام  
کے ۱۵۹ راوی ہیں۔ اور ان میں سے معدوے چند کو معتبر قرار دیا گیا ہے باقی تمام کو  
ضعیف اور ناقابل اعتماد قرار دیا گیا ہے۔ (ایضاً جلد اول صفحات ۲۸۰ تا ۵۳۸) اس  
حدیث کے اردو ترجمے میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہ راوی بصرہ کے رہنے والے  
تھے۔ اگر یہ تصریح ٹھیک ہے تو وہ اس حدیث کے سب سے کمزور راوی قرار پاتے  
ہیں۔ اس کے بارے میں آئمہ حدیث نے بتایا ہے کہ وہ ایک مجہول شخص تھا۔ جس  
کا اتہ پتہ کسی کو معلوم نہیں (ایضاً صفحہ ۵۰۶)

چوتھے راوی حضرت ابو بکرہ ہیں۔ آپ کا اصل نام نقیع بن الحارث تھا۔ اور

آپ ان تینوں صحابہ کرام میں سے تھے۔ جنہیں حضرت عمرؓ نے جرائم کے ارتکاب کے نتیجے میں کوڑوں کی سزا دی تھی۔ دوسرے دو صحابی حضرت نافع بن الحارث اور شبل بن معبد تھے۔ کوڑوں کی سزا دینے کے بعد حضرت عمرؓ نے ان سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا، دوسرے دو صحابہ نے تو تعمیل کی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا اسی بنا پر بعد میں حضرت عمرؓ نے ان کی گواہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ (تہذیب التہذیب از علامہ ابن حجر عسقلانی جلد دہم صفحہ

(۴۶۹)

در اصل یہ حدیث، جیسا کہ اس کے متن سے ظاہر ہے، حضرت عائشہؓ کو مطعون کرنے کے لیے وضع کی تھی۔ کیونکہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے مسلمان فوج کی قیادت کی تھی، ان کے اس عمل سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایک مسلمان عورت فوج کی کمانڈر انچیف بھی ہو سکتی ہے اور سربراہ مملکت بھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس روایت کو بیان نہیں کیا۔ بیان کیا تو ایک ایسے شخص نے جس کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔

اب آئیے دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن مجید کے کیا احکامات ہیں اسلامی ریاست کے مقاصد کے بارے میں قرآن مجید میں یہ ارشاد ہوا ہے۔

”وہ لوگ جنہیں ہم اگر اس زمین پر قائم کرتے ہیں۔ (یعنی ان کی حکومت قائم کرتے ہیں، تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے اور انہیں برائی سے روکیں گے۔“ (سورۃ الحج - ۴۱)

اس آیت میں اسلامی حکومت کے قیام کے چار مقاصد گنائے گئے ہیں لیکن اس کی ساتھ یہ نہیں فرمایا گیا۔ کہ اسلامی حکومت کے یہ مقاصد صرف مرد پورا کر سکیں گے۔ بلکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انہیں مردوں اور عورتوں دونوں

کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۷ میں ارشاد ہے۔  
 ”مومن مرد اور مومن عورتیں“ یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم  
 دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور  
 اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل  
 ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حاکم و دانا ہے۔“ (سورۃ التوبہ۔ آیت ۱۷)

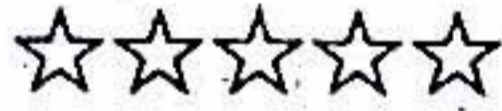
سورۃ الحج میں اسلامی حکومت کے جو چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں، یہاں ان  
 چاروں مقاصد کی تکمیل مردوں اور عورتوں کی مشترکہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے،  
 جس سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں ہر عہدے کے لیے مردوں اور عورتوں کی  
 برابر کی ذمہ داریاں ہیں اگر مرد سربراہ مملکت بن سکتا ہے تو عورت بھی اور پھر  
 عورت کے سربراہ مملکت بننے کے بارے میں خود قرآن مجید میں تفصیلات بیان کی گئی  
 ہیں۔ قرآن مجید میں ملکہ سبا کا واقعہ بیان ہوا ہے اس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے  
 کہ ان کی وسیع و عریض مملکت تھی، ملک خوشحال تھا۔ اس بارے میں ہمارے  
 مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ اس نے ملک کا انتظام چلانے کے لیے ایک قومی اسمبلی قائم  
 کر رکھی تھی، جس کے اراکین کی تعداد ۳۱۲ تھی، ملکہ سبا جس کا نام بلقیس تھا  
 حکومت اور اسمبلی کی سربراہ تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں اسلام  
 لانے کی دعوت دی تو اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ممبران اسمبلی کے  
 سامنے رکھا، ان ممبران کو اپنی طاقت کا غرور تھا، انہوں نے حضرت سلیمان سے لڑائی  
 کرنے کا مشورہ دیا۔ (سورۃ النمل آیات ۲۹ تا ۳۳)

لیکن قرآن مجید کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت ان تمام ۳۱۲  
 ممبروں سے زیادہ ذہین تھی، اس نے کہا کہ مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام دنیاوی  
 بادشاہ معلوم نہیں دیتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معلوم ہوتے ہیں، ان کی اصل  
 حیثیت جانچنے کے لیے میں ایک قیمتی تحفہ حضرت سلیمان کو بھیجتی ہوں۔ اگر انہوں  
 نے وہ قبول کر لیا، تو واضح ہو جائے گا کہ وہ ایک دنیاوی بادشاہ ہیں، اس کے بعد ہم



ان کے ملک پر چڑھائی کر دیں گے۔ لیکن حضرت سلیمان نے وہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں چنانچہ ملکہ بلقیس نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد بعض مفسرین کے نزدیک اس نے حضرت سلیمان سے شادی کر لی تھی جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اس کے ملک یمن میں رہنے دیا اور وہاں کے ایک بادشاہ سے اس کی شادی کرادی۔

ان تفصیلات سے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی قومی اسمبلی کے ۳۱۲ اراکین میں سے زیادہ ذہین اور لائق تھی اور اپنے ملک کا انتظام حسن و خوبی سے چلا رہی تھی، قرآن مجید میں ان کی حکومت کی اشارتاً بھی مذمت نہیں کی گئی، بلکہ ان تفصیلات سے تعریف کا پہلو ہی نکلتا ہے۔ اس واقعہ کو اگر ان قرآن احکامات کی روشنی میں دیکھا جائے جو سورۃ الحج اور سورۃ التوبہ کے حوالے سے اوپر بیان کیے جا چکے ہیں، تو اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسلمان عورت اسلامی ملک کی سزبارہ بن سکتی ہے۔ اور اسلامی فوج کی کمان بھی کر سکتی ہے۔ قاضی کا عہدہ تو ان سے کم تر ہے اس لئے اس کے قاضی بننے میں بھی کوئی حرج نہیں۔



## حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے مسلمان حکمرانوں کا احتساب

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کی سب سے زیادہ بہادر خاتون تھیں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو افراتفری پھیلی تو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ حضرت عثمان کو شہید کرنے والے شریکوں پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے۔ وہ اس مقصد کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جمع ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوراً ان کی سرکوبی کے لئے تیار ہو گئیں۔

چنانچہ ان شریکوں کی سرکوبی کے لئے آپ نے مسلمانوں کی اس فوج کی قیادت کی جس میں تیس ہزار صحابہ کرام شامل تھے۔ ان میں وہ صحابہ کرام بھی تھے جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا تھا۔ بعض مورخین نے یہ غلط تصور دیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ختم کرنے کی سعی کر رہی تھیں۔ لیکن یہ بات تاریخ حقائق کے خلاف ہے۔ کیونکہ جنگ جمل کے بعد آپ نے سرکردہ صحابہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیں۔ (تاریخ طبری جلد ہشتم صفحہ

خیال رہے کہ علامہ طبری جس کی کتاب سے یہ حوالہ دیا گیا ہے شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک گونہ محبت تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس تاریخی حقیقت کو مسخ نہیں کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی لشکر کشی کا مقصد ان مفسدین کے لیڈروں کی سرکوبی کرنا تھا۔ جنہوں نے خلیفہ ثالث کو شہید کر ڈالا تھا اور یہ اس لئے ضروری تھا کہ آئندہ کیلئے اس قسم کے مفسدوں کا خطرہ نہ رہے اگرچہ یہ مفسد لوگ چالاک تھے لیکن اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انہیں سزا دینے میں کامیاب ہو گئیں اور جنگ جمل کے نتیجے میں ان کی طاقت ٹوٹ گئی تھی تاہم کچھ لوگوں نے جو ان مفسدوں کے پروپیگنڈے سے متاثر تھے حضرت عائشہ کا یوں جنگ میں مسلمانوں کی قیادت کرنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے اس بارے میں احادیث وضع کیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے اور یہ کہ عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے کو آپ نے ناپسند فرمایا کہ جو قوم اپنے معاملات عورتوں کو سونپ دے گی وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔ اس حدیث میں جنگ جمل کا بھی ذکر تھا۔ اور اس کے ذریعے حضرت عائشہ کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ان کا جنگ جمل میں مسلمانوں فوج کی قیادت کرنا خلاف اسلام تھا۔

اس حدیث کے بارے میں امروز کے کالموں میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے کہ اس کے چاروں راوی غیر ثقہ تھے یہاں تک کہ اس کے صحابی راوی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایک سنگین اخلاقی جرم کی پاداش میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑوں کی سزا دی تھی اور سزا دینے کے باوجود اس کی گواہی کو تسلیم نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب از علامہ ابن حجر عسقلانی جلد دہم صفحہ ۴۶۹) ایسا شخص جس کی چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات میں گواہی قبول نہیں کی جاتی تھی، اس کی روایت حدیث پر کیے اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

یہ روایت بھی وضع کی گئی کہ حضرت عائشہ کو شریکوں کی مہم پر جانے کا بعد میں افسوس ہوا اور یہ تاثر دیا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس مقصد کے لئے گھر سے نہ نکلتیں۔ تاریخی حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ روایت بھی غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندگی کے آخری سانسوں تک عملی سیاست میں حصہ لیتی رہیں اور مسلمانوں حکمرانوں کی غلطیوں پر ان پر سخت احتساب کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے آدمی رکھے ہوئے تھے جو انہیں مملکت کے تمام امور سے باخبر رکھتے تھے اور جہاں بھی وہ کوئی خرابی پاتیں اس کا سختی سے نوٹس لیتیں بلکہ ایک دفعہ تو ایک ایسے ہی واقعہ کی بناء پر آپ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت ساری اسلامی دنیا کے باختیار حکمران تھے، کو قتل کرنے کی بھی دھمکی دے دی تھی۔ اس واقعہ کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

کوفہ میں ایک صحابی حضرت حجر بن عدی مقیم تھے۔ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر سخت تنقید کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اس تنقید میں سخت تشدد ہو جاتے۔ کوفہ کے گورنر نے ان کی زبان بندی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے، بلکہ ان کے ساتھ جب حکومت کی جانب سے تشدد برتا گیا تو ان کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نوٹس میں لایا گیا انہیں خدشہ ہوا کہ یہ معاملہ کہیں ان کے خلاف تحریک کی شکل اختیار نہ کر لے تو آپ نے حضرت حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا جب انہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے لایا گیا اور آپ نے انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تو حضرت حجر بن عدی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ خیال رہے کہ اب لوگوں میں یہ جرات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس کارروائی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جو انہوں نے مفسدوں کے خلاف کی تھی۔ حضرت حجر بن عدی کے انکار پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔

جب اس قتل کی خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو امور سلطنت سے کس طرح باخبر رکھتی تھیں تو انہوں نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”اے معاویہ! تم نے حجر بن وائل رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور وہ سب کچھ کر لیا جو کرنا چاہا۔ کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں ہوا کہ میں بھی کسی شخص کو پوشیدہ طور پر تمہارے قتل پر لگا سکتی ہوں۔“ (البدایہ والنہایہ جلد ہشتم صفحہ ۵۵)

پھر فرمایا کہ اگر بد اندیشوں اور یوقوفوں کے غلبے کا اندیشہ نہ ہوتا تو حجر کے قتل کے سلسلے میں میرا اور معاویہ کا معاملہ کچھ یہی ہوتا۔ (ایضاً)

مختصر یہ کہ حضرت عائشہ حضرت حجر بن عدی کے قتل کی وجہ سے حضرت امیر معاویہ سے اتنی سخت ناراض ہوئیں کہ آپ اسے اس جرم کی پاداش میں قتل کرنا چاہتی تھیں اور جس قسم کا انہوں نے سیاسی نظام قائم کر رکھا تھا اس کی تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنا بھی سکتی تھیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلامی معاشرے میں جو طوائف الملوکی پھیلی تھی کہ جس کی سرکوبی کیلئے انہیں جنگ جمل لڑنی پڑی تھی۔ اس جیسی صورت حالات کو دوبارہ پیدا ہونے سے روکنے کیلئے آپ نے یہ انتہائی قدم نہ اٹھایا بعد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کا خواستگار ہوا لیکن آپ نے انہیں معاف کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس اہم تاریخی واقعہ سے بہت سے معاملات واضح ہو جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ حضرت عائشہ حضرت امیر معاویہ کی طرفدار تھیں اس لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی تھی۔ انہوں نے جس طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو قتل کی دھمکی دی۔ اس کی روشنی میں کوئی انہیں آپ کا حمایتی نہیں کہہ سکتا۔ اپنے ساتھیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا حکم دیا تھا اگر ان کی خلافت کو ختم کرنے کا ارادہ ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتیں تیسری یہ کہ وہ جنگ جمل میں حصہ لینے پر شرمندہ

تھیں اگر معاملہ ایسا ہوتا تو پھر وہ کبھی سیاست میں حصہ نہ لیتیں جبکہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک سیاست میں حصہ لیتی رہیں۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ جیسے زبردست حکمران کو آپ نے قتل تک کی دھمکی دے ڈالی تھی۔

دراصل حضرت عائشہ کسی ذاتی مقصد کیلئے ملکی سیاست میں حصہ نہیں لیتی تھیں وہ ملک سے خرابیاں ختم کرنا چاہتی تھیں اور انہوں نے اس مقصد کیلئے عملی کارروائی کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ بہت سی خرابیوں سے بچ گئی۔ معلوم نہیں کہ اگر آپ اس طرح سیاست میں سرگرم حصہ نہ لیتیں تو امت مسلمہ کو کن کن مصائب کا شکار ہونا پڑتا۔ (جولائی ۱۹۸۹ء)



## مطلقہ عورت کے اسلامی حقوق

ان دنوں بھارت کے اخبارات میں شاہ بانو کیس کو خوب خوب اچھالا جا رہا ہے اس کیس کی کچھ تفصیلات ہمارے اخبارات میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطابق بھارت کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں اس سلسلے میں بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں کچھ لوگ اس کیس کے پردے میں اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑا رہے ہیں اور ہندوستان کے آئین جس کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ کو اسلامی تعلیمات سے برتر ثابت کر رہے ہیں۔ یہ صورت حالات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس سارے معاملے کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

اخباری خبروں کے مطابق بھارت کے ایک مسلمان ایڈووکیٹ صاحب نے چالیس پچاس سال کی رفاقت کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے بعض خبروں میں ساٹھ سال کا عرصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسلام نے مرد کو طلاق کا حق ضرور دیا ہے لیکن اس کی تعلیمات یہ برگز اجازت نہیں دیتی کہ پچاس ساٹھ سال کی رفاقت کے بعد ایسی حرّت کی جائے۔ مظانہ نے بھارتی سپریم کورٹ میں اپنے سابقہ خاوند کے خلاف اس بنا پر نفاذ کا دعوٰی لیا کہ چونکہ اب وہ شادی کی عمر سے گزر چکی ہے اس لئے

اسے تاحیات نفقہ دلوایا جائے۔ عدالت نے بھارتی آئین کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

خاوند نے اس فیصلے کے خلاف علماء سے ایک فتویٰ جاری کروا دیا کہ عدالت کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے عائلی معاملات میں بے جا مداخلت ہے۔ فتویٰ کے مطابق طلاق کے بعد بیوی کا رشتہ ہمیشہ کے لئے خاوند سے ختم ہو جاتا ہے اس لئے وہ کسی قسم کے نفقے (اخراجات) کی حقدار نہیں۔ اس فتویٰ کی وجہ سے بھارت کے مختلف شہروں میں مسلمانوں نے عدالت کے اس فیصلے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا بعض جگہوں پر مظاہرے بھی ہوئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو بھارتی آئین کی دفعہ ۱۲۵ سے مستثنیٰ قرار دے دے اس سلسلے میں علماء کی ایک جماعت نے ہندوستان کے وزیراعظم سے ملاقات کا وقت بھی مانگا ہے تاکہ اس کے سامنے بالمشافہ طور پر اسلام کا نفقہ نظر پیش کیا جاسکے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے حالیہ اور سابقہ جج حضرات نے مسلمانوں نے اس احتجاج پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے ۲۲ دسمبر کو نئی دہلی میں اس بارے میں وکلاء کی بھارتی انجمن کی جانب سے منعقدہ ایک میٹنگ میں بھارتی سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس ڈی اے ڈیاسی نے کہا کہ کسی بھی فرقے کے پرنسپل لاء سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے کسی بھی ایسے اقدام کے مخالفت کی جس کے تحت کسی بھی فرقے کو بھارتی آئین کی دفعہ ۱۲ کے دائرہ عمل سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ جسٹس ڈیاسی نے کہا کہ اگر مطلقہ عورت کا کوئی ذریعہ آمدنی انہیں تو اس کے سابقہ شوہر کو اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔

مسلمانوں نے جو اس فیصلے کو مداخلت فی الدین قرار دیا ہے تو اس کے پردے میں کچھ لوگوں نے اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کیسی ہیں کہ ایک بوڑھی عورت کو ساٹھ سال کی رفاقت کے بعد طلاق دے کر گلی میں پھینک دیا جائے اور قانون اس کی کوئی مدد نہ کرے اور اگر قانون اس کی مدد کرے تو اسے مداخلت فی الدین قرار دے کر شور مچایا جائے۔ کیا





لیا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں بڑا فرق ہے اس کی وضاحت سرکاری ملازم کی تنخواہ سے ہو گئی، جو اسے کام کرنے کے بدلے میں ملتی ہے، لیکن آخری عمر میں جب وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہنا تو اسے کام کئے بغیر اس کی سابقہ خدمات کا صلہ دیا جاتا ہے۔ حنفی فقہ کا یہ اصول قرآن مجید کے اس ارشاد کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔  
**و للمطلقات متاعا بالمعروف حقا علی المتقین۔** (ترجمہ) اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو، ان کی معروف طریقے سے مالی مدد کی جائے یہ متقی لوگوں پر فرض ہے۔

فقہاء کی اکثریت کے نزدیک یہ متع، حق مہر کی رقم کے علاوہ ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مطلقہ کو اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ششم صفحہ ۱۷۲)  
 متع کی شرح کے تعین کے بارے میں سلف صالحین میں اختلاف رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ تیس درہم ہے جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ سابقہ خاوند اپنے خرچ پر مطلقہ بیوی کو ایک خادم مہیا کرے جو بقیہ عمر اس کی خدمت کرے۔ بعض حضرات زیادہ سے زیادہ نقد رقم دینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ مال کے لالچ کی وجہ سے کوئی دوسرا مرد اس سے شادی کر لے۔ اس لئے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی مطلقہ بیوی کو بیس ہزار درہم یا دینار اور ایک مشکیزہ شہد کا دیا۔ (الجامع الاحکام القرآن جلد سوم صفحہ ۲۰۱)

خیال رہے طلاق دینے والے خاوندوں کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی مطلقہ کی کسی دوسری جگہ شادی ہو جائے اور چونکہ مال کا لالچ ہر ایک کو ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حسب استطاعت کافی مال اپنی مطلقہ کو دیتے تھے تاکہ اس کی دوسری جگہ شادی ہو جائے۔ امام ابن نجیم نے اسی متع کو صلہ کی اصطلاح سے بیان کیا ہے۔ غور فرمائیے کہ اگر قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں ایک مطلقہ کو سابق خاوند کے خرچ پر نوکر مہیا کیا جاسکتا ہے، تو خود اس کے اخراجات مہیا کرنے کو کیسے خلاف اسلام قرار دیا

جاسکتا ہے؟۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ بہت سے فقہاء کے نزدیک طلاق کے بعد بیوی کا خاوند سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اگر اس کی عدت کے دوران خاوند مر جائے تو اسے اس کے ماتم میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام ثوری، امام حسن بن حی اور امام ابو ثور کے نزدیک طلاق کے بعد بھی کچھ رشتہ باقی رہتا ہے۔ اس لئے وہ اس صورت میں خاوند کی موت پر بیوی کا ماتم میں شریک ہونا لازمی قرار دیتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۲)

اس بارے میں حنفی فقہ کی ایک اور نظیر ان مثالوں سے بھی زیادہ واضح ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر خاوند زندگی میں اپنی بیوی کو مناسب نفقہ مہیا نہیں کرتا۔ وہ عدالت کی مدد سے ایسا کرا سکتی ہے اور یہ نفقہ اسے خاوند کی گرفتاری یا اس کے طلاق دینے کے باوجود بھی ملتا رہے گا۔ حنفی فقہ کے ایک امام بن نجیم نے اپنی مشہور کتاب البحر الرائق جلد چہارم میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ عورت کو عدالت کا مقرر کردہ نفقہ ملتا رہے گا یا ساقط ہو جائے گا۔ کچھ فقہاء کے نزدیک یہ ساقط ہو جائے گا اور نہیں ملے گا۔ اس کے نزدیک خاوند کو یہ نفقہ طلاق کے بعد بھی ادا کرنا ہوگا۔ فتاویٰ البقالی میں اس بارے میں ابو یوسف اور امام محمد کا اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ امام محمد کے نزدیک یہ ساقط ہو جائے گا جب کہ عام ابو یوسف کے نزدیک ملے گا۔ بحث کے آخر میں ابن نجیم اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ ان میں سے نفقہ ساقط ہونے والا قول ضعیف ہے خاوند کو نفقہ ادا کرنا ہوگا اور وہ اس کی دلیل دیتے ہیں کہ تمام الفقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر کسی عورت نے عدالت سے نفقہ مقرر کروالیا۔ اور خاوند اس کے دینے سے انکاری ہو تو اسے قید کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اگر یہ طلاق دینے کے ذریعے رک سکتا تو وہ جیل جانے کی بجائے بیوی کو طلاق دے کر گلو خلاصی کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے طلاق دینے کے

بعد بھی اسے اپنی مطلقہ بیوی کا نفقہ ادا کرنا ہوگا۔ اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں میں یہ تین نظائر پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں طلاق کے بعد مطلقہ کو قانون کی مدد سے نفقہ مہیا کرنا مداخلت فی الدین نہیں۔ علماء حضرات کو ان تفصیلات کی روشنی میں اس اہم مسئلہ پر غور فرمانا چاہیے اور مخالفین کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ پروپیگنڈہ کرتے پھریں کہ اسلام لاچار مطلقہ عورتوں کی مدد کی اجازت نہیں دیتا۔



## اسلامی عدالتی نظام کے ذریعے عورتوں سے نا انصافیاں ختم کرنی ہونگی

ہمارے ملک میں بڑے شہروں اور اکثر ترقی یافتہ علاقوں میں عورتوں کے قد مردوں کی نسبت عام طور پر چھوٹی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ملک کے بعض ایسے حصوں میں جنہیں غیر ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ صورت حال مختلف ہے۔ وہاں کے مردوں اور عورتوں کے قدوں میں اول تو کوئی فرق ہی نہیں اگر فرق ہے بھی تو بہت ہی معمولی۔ رقم کا تعلق بھی ملک کے ایک ایسے حصے سے ہے جہاں یہ فرق کم ہے اسی دوران راقم کو چند عرب اور یورپی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی یہ فرق کم پایا چنانچہ ذہن میں جستجو پیدا ہوئی کہ اس امر کی وجوہات معلوم کی جائیں کہ ہمارے ملک کے ترقی یافتہ علاقوں میں عورتوں کے قد نسبتاً چھوٹے کیوں ہیں۔

دنیا کے مختلف معاشرہوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کرہ ارض پر صرف دو معاشرے ایسے ہیں جہاں مردوں اور عورتوں کے قدوں میں اتنا تفاوت پایا جاتا ہے۔ یہ دو ہندوستانی چینی معاشرے ہیں ان معاشرہوں میں ابتداء سے لے کر آج کے دن تک لڑکوں کو معاشی سہارا سمجھا جاتا رہا ہے جبکہ

لڑکیوں کو خاندان پر ناروا بوجھ لڑکے بڑھاپے میں والدین کی کفالت کے ذمہ دار تصور کئے جاتے جبکہ لڑکیوں سے ایسی مالی مدد کی توقع کی بجائے انہیں شادی کے موقع پر بھاری جہیز مہیا کرنا پڑتا۔ اسی بنا پر لڑکیوں سے پیدائش کے فوراً بعد امتیازی سلوک برتا جانے لگا۔ ہر خاندان کی خواہش ہوتی کہ اس کے ہاں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوں۔ لڑکیوں کو ناپسندیدہ مہمان سمجھا جاتا۔ لڑکوں کو عام طور پر لمبے عرصے تک دودھ پلایا جاتا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے دوسرے حمل میں لمبے عرصے کا وقفہ ہو جسے لڑکے کی مناسب پرورش کیلئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

لڑکی کی پیدائش کی صورت میں طرز عمل مختلف ہوتا۔ مائیں جلدی سے دودھ چھڑا کر انہیں ٹھوس غذا کا عادی بناتیں۔ اس طرح لڑکے کے شوق میں مائیں دوبارہ جلد حاملہ ہو جاتیں لیکن ماں کی دودھ کی محرومی کی وجہ سے لڑکیوں کی صحیح نشوونما نہ ہوتی اور پھر اگر اس کمی کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتیں تو انہیں مناسب طبی امداد مہیا نہ کی جاتی بلکہ اگر وہ مرجاتیں تو والدین راحت محسوس کرتے کتنے دکھ کی بات ہے کہ ابھی تک ہمارے معاشرے میں یہی ذہنیت کار فرما ہے اس کے مقابلے میں لڑکے کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اسے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے ماں کا دودھ چھڑانے کے بعد بھی اسے عمدہ سے عمدہ غذا فراہم کی جاتی ہے تاکہ اس کی نشوونما میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ انہیں تو ہمیشہ اچھی خوراک مہیا کی جاتی اور لڑکیوں کو بچی کچھی خوراک پر اکتفا کرنا پڑتا ہے بعض خاندانوں میں اب بھی یہ عادت ہے کہ مرد اور لڑکے پہلے کھانا کھاتے ہیں اور جوان سے بچ جاتا ہے وہ بعد میں عورتیں اور لڑکیاں کھاتی ہیں اور اگر کچھ نہ بچے تو ان بیچاروں کو بعض اوقات بھوکا بھی رہنا پڑ جاتا ہے۔ لڑکیوں کی پرورش کے سلسلے میں ان سے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے ان میں شرح اموات زیادہ رہی ہے اور مناسب نشوونما نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قد چھوٹے رہ جاتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگر دوسری نسل کی بچیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہو تو ان کے قد مزید متاثر ہوتے اور مردوں اور

عورتوں کے قدوں میں تفاوت دن بدن بڑھتا جاتا۔

عرب اور دوسرے مسلمان ممالک سے جو مسلمان برصغیر آئے۔ شروع شروع میں ان کے مردوں اور عورتوں کے قدوں میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد ان مسلمانوں نے بھی یہاں کے ہندوؤں کی رسموں کو اپنانا شروع کیا۔ جینز کی رسم کہ جس سے مسلمان ابھی تک نابلد تھے اپنالیا گیا اور اس کے نتیجے میں لڑکیوں کو خاندان پر بوجھ سمجھا جانے لگا جو ہندو اپنی لڑکیوں سے کرتے تھے چنانچہ انہیں بھی ایسے ہی نتائج سے دو چار ہونا پڑا۔ عرب اور ہمارے پڑوسی ممالک ایران اور افغانستان میں ابھی تک شادی کے سلسلے میں اسلامی احکامات پر عمل ہوتا ہے ان ممالک میں شادیوں کے موقع پر لڑکیوں کو بھاری جینز مہیا نہیں کئے جاتے بلکہ شادی کے تمام اخراجات ہونے والے خاوند کے ذمے ہوتے ہیں اسی بنا پر ان ممالک میں بچیوں کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا کہ جس کی وجہ سے ان سے بچپن میں امتیازی سلوک برتیں یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ان ممالک میں عورتوں کے قد متاثر نہیں ہوئے اور اگر کوئی فرق پایا بھی جاتا ہے تو وہ بہت معمولی ہے۔

ہمارے موجودہ معاشرے نے اسلام کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود بہت سی ہندوانہ رسموں کو اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے اب ہمارے ہاں بھی لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ لڑکوں کی پیدائش پر افسوس بلکہ بعض اوقات ماتم کہا جاتا ہے۔ اس غیر اسلامی طرز عمل کو ختم کرنا ہوگا۔

قدامت پرست علاقوں میں ابھی تک لڑکی کے شادی کے اخراجات ہونے والے خاوند کو برداشت کرنے ہوتے ہیں اور نہ ہی والدین کو جینز کا بھاری بوجھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو خاندان کے لیے بوجھ نہیں سمجھتے لیکن ملک کے ترقی یافتہ علاقوں کے اثر سے اب ان علاقوں میں بھی جینز کی رسم کا رواج ہو چلا ہے اور خدشہ ہے کہ وہاں کی بچیوں کو بھی انجام کار اس قسم کی صورت حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور ان کے ساتھ بھی ایسا امتیازی سلوک نہ کیا

جانے لگے کہ جس سے ان کی پرورش مناسب طریقے سے نہ ہو سکے۔

یہ صورت حالات درد مند اہل وطن کو غور و فکر کی دعوت دینی ہے اگر ہم اپنی بچیوں کی مناسب پرورش کر کے ان کی قد کی کمی کی خامی کو دور کر سکتے ہیں تو ہمیں اس طرف پیش رفت کرنی چاہیے اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات ہماری بڑی مدد کر سکتی ہیں۔ اسلام میں جینز کا کوئی تصور نہیں بلکہ شادی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری ہونے والے کاوند پر عائد ہو جاتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر امت مسلمہ کے سامنے پیش کیا اس کی شادی کے تمام اخراجات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود برداشت کئے ان اسلامی تعلیمات کو اپنانے کے بعد کوئی بھی خاندان اپنی بچیوں کو اپنے لئے بوجھ نہیں سمجھے گا اور وہ پرورش کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا شکار نہ ہوں گی اگر ان کی پرورش بھی لڑکوں کی طرح عمدہ طریقے سے ہوگی تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے قدوں میں جو اس وقت تفاوت ہے وہ بھی کم ہونا شروع ہو جائے گا اور پھر یہ بھی اسی سطح پر آجائیں گے جیسا کہ عرب اور یورپی ممالک میں دیکھتے ہیں۔ (جون ۱۹۸۷ء)





تک دینا چاہیے تھے ؟

ج:۔ جون ۱۹۴۷ء تک ۔

س:۔ مسلم لیگ نیشنل کارڈ پر پابندی کے باعث مسلم لیگ نے پنجاب میں تحریک سول نافرمانی کب شروع کی تھی ؟

ج:۔ ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو ۔

س:۔ سول نافرمانی کی تحریک کے باعث پنجاب میں کن کن اہم مسلمان شخصیات کو گرفتار کیا گیا تھا ؟

ج:۔ میاں افتخار الدین ، نواب افتخار حسین خان ممدوٹ ، میاں ممتاز محمد دولت آبادی اور سردار شوکت حیات وغیرہ کو ۔

س:۔ بتائیے تحریک سول نافرمانی میں گرفتار ہونے والے پنجاب کے رہنماؤں کو کب رہا کیا گیا تھا ؟

ج:۔ ۲۶ جنوری ۱۹۴۷ء کو ۔

س:۔ مسلم لیگ نیشنل کارڈ پر پابندی کب ختم کی گئی تھی ؟

ج:۔ ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء ۔

س:۔ پنجاب کی تاریخ میں پہلی بار کن خواتین نے مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت میں جلوس نکالا ۔

ج:۔ مس ممتاز ، بیگم فاطمہ ، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور بیڈی فیروز خان لون ۔

س:۔ برطانوی حکومت کے خلاف مظاہروں میں کس خاتون نے پنجاب سیکریٹریٹ پر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا تھا ؟

ج:۔ محترمہ صفری نے ۔

س:۔ تحریک آزادی کے دوران پنجاب میں ”خضر حیات لائے لائے“ کے نعرے لگتے تھے لیکن ۲۶ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک نیا نعرہ کیا اور کیوں لگایا گیا ؟

ج:۔ ”نازہ خیر آئی اے خضر ساد ا بھائی اے“ اس لئے کہ حکومت نے مسلم لیگ

رہتا اول سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

س :- پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات نے اقتدار مسلم لیگ کے حوالے کرنے کے لئے کس تاریخ کو استعفیٰ دیا تھا ؟

ج :- ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو۔

س :- مسلم لیگ کی حکومت کی بجائے پنجاب میں گورنر راج کیوں قائم کیا گیا تھا ؟

ج :- اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے اشتعال کے باعث پنجاب میں فسادات کی وجہ سے

س :- پنجاب اسمبلی کے باہر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے کے جواب میں یہ کس نے

کہا تھا کہ پنجاب میں حکومت کس کی ہوگی اس کا فیصلہ تلوار کرے گی ؟

ج :- ماسٹر تارا سنگھ نے۔

س :- پنجاب کے واضح غیر مسلم اکثریتی علاقے کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے۔ کانگریس

نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ مطالبہ کب کیا تھا ؟

ج :- ۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو یہ قرارداد کانگریس کی مجلسِ عاملہ میں سردار پٹیل نے

پیش کی تھی۔

س :- برطانوی وائسرائے لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن دہلی کب پہنچا اور اس نے سب سے پہلے

کس خاندان سے ذاتی مراسم بنائے ؟

ج :- ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچ کر نہرو خاندان سے گھل ملی گیا۔

س :- برطانوی حکومت نے وائسرائے ہند لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن کو کابینہ مشن کے تحت

کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کی آخری تاریخ کو کنسی مقرر کی تھی ؟

ج :- یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء۔

س :- وائسرائے ہند لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی کن شخصیات سے سب سے پہلے

ملاقات کی تھی ؟

ج :- نواب بھوپال، بہار اجہ، بیکانیر اور پنڈت نہرو سے۔

س :- لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے برصغیر کے رہنماؤں سے ملاقات کے بعد کیا نتیجہ اخذ کیا تھا ؟

ج:۔ ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے تحت نہیں چل سکتا۔  
 س:۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کو تقسیم کا اصول منوا کر صوبائی گورنروں کی کانفرنس  
 کب طلب کی تھی؟

ج:۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ والسٹرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا نیا منصوبہ برطانوی حکومت کو منظوری  
 کے لئے کب بھیجا تھا؟

ج:۔ ۲ مئی ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ ہندوستان کے انتقال اختیارات کے لئے والسٹرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے  
 کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے نمائندوں کے ساتھ ملاقات کب کی تھی؟  
 ج:۔ ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ ہندوستان کے انتقال اختیارات کے لئے والسٹرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے  
 کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے نمائندوں کے ساتھ ملاقات کب کی تھی؟  
 ج:۔ ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ ماؤنٹ بیٹن کا تیار کردہ منصوبہ تقسیم ہند برطانوی حکومت سے منظور ہو کر کب واپس آیا؟  
 ج:۔ ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ قائد اعظم اور ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات کب ہوئی؟

ج:۔ ۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو۔

س:۔ برطانوی حکومت اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کو نہرو نے کیوں مسترد کیا تھا؟  
 ج:۔ والسٹرائے نے اپنی دوستی میں نہرو کو اس کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا اور یہ  
 مسلمانوں کے حق میں تھا؟

س:۔ والسٹرائے ہند نے تقسیم ہند کے منصوبے پر نہرو کی برہمی کے باعث کس سے  
 مشورہ کیا تھا؟

ج:۔ وی پی مینن سے۔

س :- ہندوستان کے انتقالِ اختیارات کے لئے بلائی جانے والی وائسرائے کی  
میٹنگ ۱۷ مئی کی بجائے ۲ جون کے لئے کیوں ملتوی کی گئی تھی ؟

ج :- تاکہ پنڈت نہرو کی مرضی کے مطابق نیا منصوبہ برطانوی حکومت سے منظور کرالیا جائے  
س :- وائسرائے ہند لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے "متفقہ نکات" کے عنوان سے تقسیم ہند  
کے منصوبے کی کاپیاں کب اور کن کن شخصیات کو بھیجی تھیں ؟

ج :- ۱۶ مئی ۱۹۴۷ء کو۔ قائد اعظم، لیاقت علی خاں، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور بلدیو  
سنگھ کو۔

س :- ۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہونے والی وائسرائے کانفرنس میں کن کن شخصیات  
نے شرکت کی تھی ؟

ج :- قائد اعظم، لیاقت علی خاں، سردار عبدالرئیس، پنڈت نہرو، سردار پٹیل،  
اچاریہ کرپلائی اور بلدیو سنگھ۔

س :- کانگریس اور مسلم لیگ رہنماؤں نے وائسرائے ہند کی کانفرنس میں تقسیم ہند کے  
منصوبے کو آخری شکل کب دی ؟

ج :- ۳ جون ۱۹۴۷ء کو۔

س :- ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے فیصلے کے سلسلے میں ریڈیو سے کس کس نے خطاب  
کیا تھا ؟

ج :- لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور قائد اعظم محمد علی جناح نے  
س :- قائد اعظم محمد علی جناح نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ریڈیو سے تقریر کے اختتام پر کیا  
نعرہ لگایا تھا ؟

ج :- "پاکستان زندہ باد"

س :- لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن کے منصوبہ ۳ جون کو مسلم لیگ کے اجلاس میں کب منظوری  
دی گئی تھی ؟

ج :- ۱۰ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں۔

## اسلامی ریاست کے عدالتی نظام پر ایک کتاب

دور حاضر کے پیچیدہ مسائل کو اسلامی تعلیمات کے مطابق سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی نظریاتی اور عملی کاوش ایک عالمی تحریک بن کر ابھر رہی ہے۔ پاکستان میں معیشت، عدل و انصاف اور دیگر سیاسی اور معاشرتی اداروں کی اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل نو کا عمل بڑی تیزی سے جاری ہے علماء، محقق، دانش ور اور ادیب بھی اپنے رشحات فکر کے ذریعے اس تحریک کی کامیابی کے لئے کوشاں ہیں۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی تازہ ترین تصنیف ”اسلامی ریاست کا عدالتی نظام“ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس کتاب میں مصنف نے دور رسالت سے زمانہ حاضر تک اسلامی نظام عدل کے ارتقاء اور کارکردگی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس نظام کے احیاء کی اہمیت کو واضح کیا ہے کتاب کے پہلے باب میں قبل از اسلام جو عدالتی نظام دنیا میں رائج تھے ان کی جھلک پیش کی گئی ہے اس باب میں اہل عرب و یہود، یونانی، ہندی، رومی اور ایرانی عدالتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں انصاف اہل، اقتدار کے تابع تھا۔ حاکم وقت کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ معاشرے میں طبقاتی امتیاز کے باعث قانون کا دہرا معیار نافذ تھا اور



تدوین ' قاضیوں کی تربیت کا اہتمام اور اجتہاد کی روایت کے احیاء سے ہی اسلامی عدالتی نظام قائم اور کامیاب ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب علماء و کلاء منصفین اور حکام کی خاص توجہ کی مستحق ہے تاکہ وہ اسلامی انصاف کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور اسلامی قانون کی عمل داری میں صحیح کردار ادا کر سکیں۔ مصنف کا انداز بیان موثر اور دلنشین ہے ہر بار مدلل طور پر مستند حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے اسلامیات کے سرمایہ میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

کتاب کے مصنف پروفیسر رفیع اللہ شہاب ہیں اور اسے قانونی کتب خانہ کچھری روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔



## ہماری چند کتب

	انسائیکلو پیڈیا قائد اعظم	❖
پروفیسر رفیع اللہ شہاب	پاکستان کے پچاس سال	❖
رئیس احمد جعفری	خون کی ہولی	❖
رئیس احمد جعفری	آزادی ہند	❖
عشرت رحمانی	حیات جوہر	❖
عشرت رحمانی	پاکستان سے پاکستان تک	❖
ڈاکٹر ایم ایس ناز	انجام گلستاں کیا ہوگا	❖
ڈاکٹر ایم ایس ناز	لاہور نامہ	❖
منصور احمد بیٹ	محمد علی جناح	❖
پروفیسر مظفر مرزا	مسلم لیگ ایک قومی تحریک	❖
پروفیسر مظفر مرزا	عرش آزادی	❖
پروفیسر مظفر مرزا	مطالعہ پاکستان	❖
پروفیسر مظفر مرزا	ملت کا ترجمان محمد علی جناح	❖
خالد محمود	رن کچھ سے چونڈہ تک	❖



س :- کانگریس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبہ ۳ جون کی ضمنی منظوری کب دی تھی ؟  
ج :- ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو۔

س :- قیام پاکستان کے منصوبے کی تائید ہندوستان کے کن کن علاقوں سے کی گئی تھی ؟  
ج :- مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد سے۔  
س :- سندھ اسمبلی نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کس تاریخ کو کیا تھا ؟  
ج :- ۲۶ جون ۱۹۴۷ء کو۔

س :- بنگال اور پنجاب نے "پاکستان" کے حق میں تقسیم ہونے کا فیصلہ کب کیا تھا ؟  
ج :- ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کو۔

س :- تقسیم ہند کے بعد دونوں ممالک کا مشترکہ گورنر جنرل بننے کا خواہشمند کون تھا ؟  
ج :- لارڈ ماؤنٹ بیٹن (وائسرائے ہند)۔  
س :- لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل بننے کی دعوت کس نے دی تھی مسلم لیگ  
یا کانگریس نے ؟

ج :- کانگریس نے۔  
س :- لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مشترکہ گورنر جنرل بنائے جانے پر قائد اعظم نے کیوں  
اعتراض کیا تھا ؟  
ج :- اس لیے کہ انہیں اس پر اعتماد نہ تھا۔

س :- ۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کیا پیغام بھیجا تھا ؟  
ج :- بعض وجوہات کی بناء پر میں نے خود پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا ہے۔  
س :- برطانوی پارلیمنٹ نے قانون آزادی ہند کب منظور کیا تھا ؟  
ج :- ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو۔

س :- قانون آزادی ہند پر تاجدار انگلستان نے کب دستخط کیے تھے ؟  
ج :- ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء۔

س :- ہندوستان کی تقسیم کے بعد اقتدار کی منتقلی کے لیے کون سی تاریخ مقرر کی گئی تھی ؟

- ج:۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء
- س:۔ پنجاب اور بنگال کی حد بندی کے لئے حکومت برطانیہ نے کس کو مقرر کیا تھا؟
- ج:۔ ریڈ کلف (حد بندی کمیشن کا چیئرمین)
- س:۔ حد بندی کمیشن کا چیئرمین برطانوی وکیل ریڈ کلف برصغیر کب پہنچا تھا؟
- ج:۔ ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو۔
- س:۔ بتائیے پنجاب کی حد بندی کے لئے کون افراد کو کمیشن کارکن نامزد کیا گیا تھا؟
- ج:۔ جسٹس دین محمد، جسٹس محمد منیر، ہندو نوجہر چند، مہاجن اور سردار تیا سنگھ کو۔
- س:۔ حد بندی کمیشن کا چیئرمین ریڈ کلف پہلی بار لاہور کب آیا تھا؟
- ج:۔ ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو۔
- س:۔ ہندوستان کی تقسیم کے سلسلے میں ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن نے کس پالیسی سے کام لیا تھا؟
- ج:۔ ہندو دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گورداس پور اور بٹالہ کی تحصیلیں بھارت میں شامل کر دیں۔
- س:۔ ہندوستان کی فوج کے لئے فوج کی نفری اور فوجی سامان کی تقسیم کا کام کس کے سپرد کیا گیا تھا؟
- ج:۔ کمانڈر انچیف سر کلاڈ اکنلیک کے (جس کا نیا عہدہ سپریم کمانڈر تھا)
- س:۔ سر کلاڈ اکنلیک نے فوج کی نفری کو الگ الگ کرنے کا کام کس تاریخ تک مکمل کر لیا تھا؟
- ج:۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک (بڑی اہم انداری کے ساتھ)
- س:۔ سر کلاڈ اکنلیک کو اہم انداری کا صلہ کیا ملا؟
- ج:۔ انجینئر ماؤنٹ بیٹن نے فوراً برطانیہ واپس بھجوا دیا
- س:۔ تقسیم ہند کا خواب پورا ہوتا نظر آیا تو سکھوں نے کون سا نعرہ بلند کیا تھا؟
- ج:۔ جمناسے چناب تک سکھ حکومت قائم کریں گے۔

س: قائد اعظمؒ حد بندی کی ذمہ داری کس ادارے سے پوری کرانا چاہتے تھے؟  
ج: اقوام متحدہ سے۔

س: بتائیے ۱۹۴۷ء کے آخر تک کتنے مہاجرین بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے؟

ج: ۶۰ لاکھ سے زائد۔

س: پاکستان بننے کے بعد ترک وطن کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کیا تھی؟

ج: ۵ لاکھ۔

س: پاکستان کا دارالحکومت کراچی کو بتاتے جانے کا فیصلہ کب ہوا تھا؟

ج: ۳ جون ۱۹۴۷ء کو۔

س: قائد اعظمؒ اقتدار کی منتقلی کے لئے کراچی کب اور کیسے پہنچے تھے؟

ج: ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو بذریعہ ہوائی جہاز۔

س: قائد اعظمؒ کو پاکستان کا اقتدار منتقل کرنے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کب کراچی پہنچا

تھا؟

ج: ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو۔

س: پاکستان کے اقتدار کی منتقلی کی رسم کب اور کہاں ادا کی گئی؟

ج: ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی میں۔

س: پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور پہلی کابینہ کی رسم حلف برداری کب ادا کی گئی تھی؟

ج: ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں۔



- ڈاکٹر ایم ایس ناز      انسائیکلو پیڈیا اصحاب النبیؐ  
 ڈاکٹر ایم ایس ناز      حضرت اویس قرنیؓ  
 سید علی بلگرامی      تمدن عرب  
 سید علی بلگرامی      تمدن ہند  
 سید واجد رضوی      زوال ملت  
 سید واجد رضوی      ذوق جہاد  
 عبدالمجید ساگر      غزوات اسلام  
 مولانا سعید احمد      مسلمانوں کا عروج و زوال  
 محمد احسان الحق سلیمانی      مسلمان یورپ میں  
 حفیظ اللہ منظر      اسلام کے عظیم سائنسدان  
 خالد محمود      داتا گنج بخش اور ان کا عہد

لغتی

احسان الحق سلیمانی

قمر نقوی

مقصود ایاز

مفتی کفایت اللہ

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

مولانا نجم الدین

ڈاکٹر ایم ایس ناز

ستار طاہر

قرآن حکیم اور ہماری زندگی

تین عظیم فلسفی

خلافت راشدہ

تعلیم الاسلام

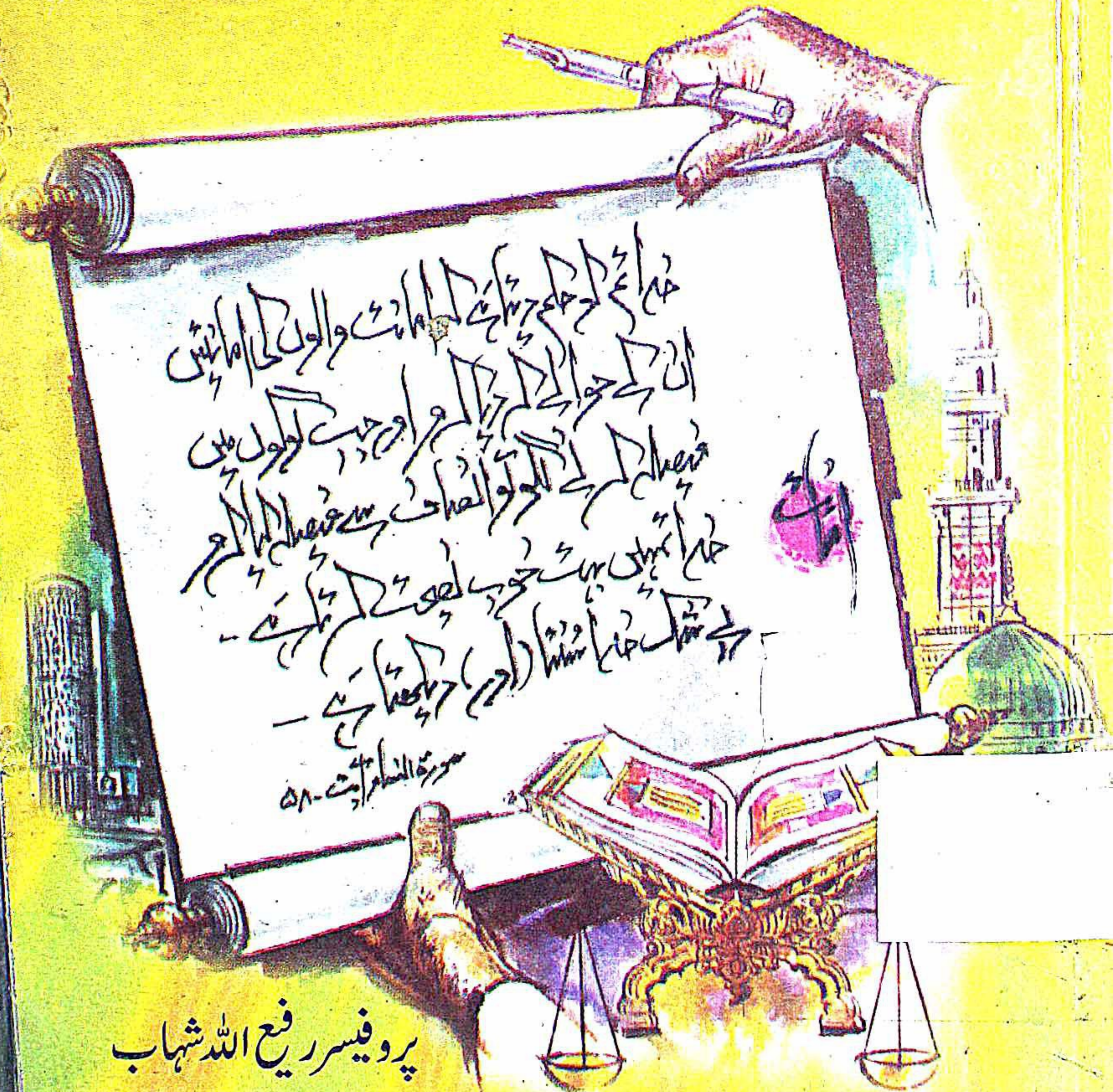
اجتہاد و اختلافات

رسوم جاہلیت

آفتاب مہران

پاکستان کا سیاسی سفر نامہ

# عدل کا اسلامی تصور



پروفیسر رفیع اللہ شہاب